قرآن وسنت اور اسلاف امت کی تعلیمات کا داعی
دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

مجلّہ صدائے حق بنگلور

سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری زیدت معالیھم

استاذ حدیث ومدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مدیر

عبدالرزاق بنگلوری

نائب مدیر

مفتی عبدالرحمٰن بنگلوری

ناشر

مجلس، صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور-78

قرآن وسنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا داعی

دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

مجلّہ

صدائے حق بنگلور

جلد:۰۴	شمارہ:۸	ماہ فروری ۲۰۲۴ء	ماہ شعبان ۱۴۴۵ھ

سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری دامت برکاتہم

استاذِ حدیث ومدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مدیر	نائب مدیر
عبدالرزاق بنگلوری	مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری

مجلس ادارت

مفتی محمد علی صاحب قاسمی

مولانا محمد اُویس صاحب رشادی

مولانا عبداللطیف صاحب قاسمی

مجلسِ مشاورت

مولانا اشرف صاحب قاسمی

مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہری

مفتی عبدالفتاح صاحب قاسمی

ADVERTISEMENT TARIFF

Full Page (Title Back Cover)	6000/-
Full Page (Title Inner Cover)	5000/-

Black and White

Full Page (Inside Pages)	2000/-
Half Page (Inside Pages)	1000/-
Cuarter Page (Inside Pages)	500/-

Phone Pe & Google Pay:7406464533

مضمون نگار کی آرا سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

شائع کردہ

مجلس: صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور 78

فہرست

عناوین	مضامین	اسمائے محررین	صفحہ نمبر
اداریہ	شبِ براءت؛ شب گزاری یا شبِ آہ وزاری	مفتی عبدالرزاق بنگلوری	۳
درسِ حدیث	شراب تمام بُرائیوں کی جڑ ہے (قسط دوم)	مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری	۶
اصلاحِ معاشرہ	دینی وتہذیبی شناخت کی حفاظت: وقت کا اہم مسئلہ (قسط سوم)	مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی	۱۱
// // //	علمائے کرام کا مقام ومرتبہ اور اُن کی ذمہ داریاں	مفتی محمد اسلم صاحب رشادی	۱۶
// // //	چار صفات اپنائیں (علم، امانت، قوت، حفاظت) (قسط اوّل)	مولانا محمد اویس صاحب رشادی	۲۵
// // //	قلب کو اخلاقِ محمودہ سے مزین کرنے کا بیان (۱۰)	مفتی محمد سلطان خان صاحب قاسمی	۳۰۱
// // //	تصورِ جمہوریت	مولوی محمد عمر فاروق سلّمہٗ فتح پوری	۳۵
// // //	شاگردوں پر شفقت ونرمی کے بے مثال نمونے	مفتی احمد اللہ نثار صاحب قاسمی	۴۱
تحقیق ومسائل	قواعد فقہ کے، مسائل تصوف کے	مولانا محمد یاسین خان صاحب قاسمی رشادی	۴۹

اطلاعِ عام

نوٹ: مضمون نگار اپنے مضامین مندرجہ ذیل ای میل (E-mail) یا واٹسیپ (WhatsApp) پر ان پیج (InPage) فائل روانہ کرسکتے ہیں، جزاکم اللّٰہ خیراً وأحسن الجزاء.

Email: muftiabdurrahman57@gmail.com
Whatsapp No: 09620795460 - 9739349433

اداریہ

شبِ براءت؛ شب گزاری یا شبِ آہ وزاری

از: مفتی عبدالرزاق بنگلوری

ربِّ ذوالجلال نے اپنے الطافِ بے پایاں اور فضلِ بے کراں سے سال کے مختلف مہینوں، اس کے مختلف دنوں اور راتوں میں ایسی برکات وخصوصیات رکھ دی ہیں کہ اُن میں معمولی کوشش اور تھوڑی سی بھی محنت سے دینی ودنیاوی فوائد حاصل ہوجاتے ہیں، جن کا دوسرے اوقات میں طویل مشقت اور بڑی محنت سے بھی حاصل ہونا دشوار ہے؛ مگر آج کل لوگ دینی باتوں سے ناواقفیت کی بنا پر ایسے قیمتی مواقع کھو بیٹھتے ہیں، بعض لوگ تو اس رات میں نئے کپڑے پہننے اور پروگراموں میں شرکت کرنے کو عبادت سمجھ بیٹھے ہیں، جس کے تئیں یہ مبارک گھڑی بغیر عبادت کے صرف نئے کپڑے پہننے اور پروگراموں میں شرکت کرنے کے چکر میں ضائع ہوجاتی ہے، اور جو لوگ اس رات میں لوگوں کو جوڑ کر وعظ ونصیحت کے حربے اختیار کر کے ضیاعِ وقت کرتے ہیں، وہ درحقیقت پیشہ ور واعظ ہوتے ہیں، اُن کو دین سے کوئی سروکار نہیں، صرف لوگوں میں بیان کر کے امت سے پیسہ بٹورنا مقصود ہوتا ہے، بجائے اِس کے انفرادی اعمال اور اللہ سے اپنی مغفرت کی جستجو کے لیے آہ وزاری کرنا کثرتِ ثواب کا باعث ہوتا ہے، اور اس رات کی فضیلت احادیثِ مبارکہ میں بہ کثرت آئی ہے، ایسی مبارک راتیں اللہ کی جانب سے امتِ مسلمہ کے لیے انعام اور احسان ہوتی ہیں۔

شبِ براءت میں بدعات وخرافات:

ہمارے ملک کے اکثر علاقوں میں لوگوں کے اندر یہ رواج ہے کہ شعبان کی پندرھویں شب میں کثرت سے چراغاں کرتے ہیں، اکثر لوگوں میں اجتماعی وانفرادی طور پر آتش بازی کا مذموم طریقہ بھی رائج ہے، یہ جاہلانہ رسوم اور خلافِ شرع اُمور عقل وتہذیب دونوں کے خلاف ہے، اسلام میں ان خرافات کی قطعاً گنجائش نہیں، درحقیقت مسلمانوں نے یہ رسم ورواج ہندوؤں کے تہوار ''دیوالی'' سے لیے ہوئے ہیں۔ یاد رکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ'' (سنن ابی داؤد: ۵۵۹/۲) (جو آدمی جس قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ اُنہیں میں سے ہوگا)۔

یہاں رُک کر غور کریں کہ یہ بات بھی بعید نہیں کہ کل قیامت کے دن اُن لوگوں کا حشر بھی انہیں کے ساتھ ہوگا جن کا وہ طور وطریقہ اختیار کررہے ہیں، اللّٰھم احفظنا منه ۔اور جو طبقہ امت میں دین دار سمجھا جاتا ہے اُن کے اندر ایک طریقہ یہ بھی رائج ہے کہ اس رات کو دینی اجتماع کے نام پر لوگوں کو اکٹھا ہونے کی دعوت دی جاتی ہے، اور پھر اس میں وہ ساری قباحتیں پیش آتی ہیں جو اس قسم کے اجتماعات میں لوگوں کی غفلت اور دین سے بے پرواہی کی بنا پر ظہور پذیر ہوتی ہیں، اس خاص تاریخ میں اِس قسم کے اجتماعات کا ثبوت نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور نہ ہی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اور نہ تابعین، تبعِ تابعین اور سلفِ صالحین سے ہے؛ بلکہ اس رات میں انفرادی طور پر ذکر، تلاوت، قرآنِ پاک، نوافل کا اہتمام اور دعاؤں کی کثرت وغیرہ عبادتوں میں مشغول رہنا ہی مستحب اور مندوب ہے۔

شبِ براءت کی فضیلت:

اس رات کی فضیلت عظمت و برتری کے سلسلے میں دس صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے روایات منقول ہیں؛ مگر بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ روایات ضعیف ہیں؛ لہٰذا اس رات کی فضیلت بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کا اِس طرح کہنا سراسر غلط ہے؛ کیوں کہ یہ بات تو صحیح ہے کہ یہ احادیث ضعیف ہیں؛ مگر ان روایات کی تائید صحیح ترین احادیث سے ہوتی ہے، جس کی وجہ سے علماء اِس بات پر متفق ہیں کہ احادیثِ مبارکہ سے اس رات کی فضیلت و برتری ثابت ہے۔

الغرض! ماہِ شعبان اور اس کی پندرھویں شب کے فضائل مختصراً ترتیب کے ساتھ احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں درج ذیل ہیں:

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: رجب اور رمضان کے درمیان میں ایک ایسا مہینہ ہے (یعنی شعبان) جس سے بالعموم لوگ غفلت برتتے ہیں؛ حالاں کہ یہ ایسا مہینہ ہے جس میں رب العالمین کی بارگاہ میں بندوں کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں اور مجھے یہ بات پسند ہے کہ بارگاہِ الٰہی میں میرے اعمال بحالتِ روزہ پیش ہوں۔ (الترغیب والترہیب:۲/۱۱۶)

(۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کے علاوہ سب سے زیادہ روزہ رکھنے کا اہتمام ماہِ شعبان میں کرتے تھے۔ (مشکاۃ شریف:ص/۱۷۸)

(۳) سال بھر میں مرنے والوں کا دفتر بھی اِسی ماہ میں مرتب کیا جاتا ہے۔ (الترغیب والترہیب: ج/۲،ص/۱۱۷)

(۴) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: عبان کی پندرھویں رات کو اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں کی

جانب خصوصی رحمت ومغفرت کے ساتھ تجلی فرماتے ہیں اور تمام لوگوں کی مغفرت فرمادیتے ہیں، سوائے مشرک اور کینہ پرور کے۔ (مجمع الزوائد: ج ۸/ص ۶۷)

اِس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تجلی کا نزول اور خصوصی رحمتوں کا ظہور ہر رات کے آخری تیسرے حصے میں ہوتا ہے؛ لیکن پندرھویں شعبان کی شب میں یہ نزول سرِ شام مغرب کے وقت ہی سے شروع ہوجاتا ہے، اور اس رحمت وبخشش کا سلسلہ طلوعِ صبح تک جاری رہتا ہے، اِسی وجہ سے شعبان کی پندرھویں شب خصوصیت کے ساتھ جامع خیرات وبرکات اور حاملِ فضیلت وعظمت ہوگئی ہے۔

(۵) حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: شعبان کی پندرھویں شب میں نوافل پڑھو اور اس کے دن میں روزہ رکھو؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ سورج غروب ہوتے ہی ساری دنیا پر اپنی رحمت ومغفرت کے ساتھ نزول فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی ہے مجھ سے طالبِ رحمت، کہ میں اُس کی بخشش کروں؟ ہے کوئی روزی مانگنے والا، کہ اُسے خوب روزی عطا کروں؟ ہے کوئی مصیبت کا مارا عافیت خواہ، کہ اُسے عافیت دُوں، اِسی طرح کا کرم آفریں آعلان، طلوعِ صبح تک ہوتا رہتا ہے۔

حرفِ آخر:

پندرھویں شعبان کی رات اور اس کا دن باری تعالیٰ سے مناجات اور طلبِ حاجات کا وقت ہے، اس دن اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عامہ خصوصیت کے ساتھ بندوں کی جانب متوجہ ہوتی ہے؛ اِس لیے اس بابرکت اور پُر رونق وقت کو غنیمت سمجھنا چاہیے؛ کیوں کہ ربِّ ذوالجلال کی رحمتِ بے کراں اس وقت بندوں کی جانب متوجہ ہے، تو ہماری زندگی اور سراپا احتیاج کا یہی تقاضا ہے کہ اس کی عبادت واطاعت کے ذریعے اپنے دامنِ مراد کو خوب خوب بھرلیں، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ اے اللہ! ہم سب کو ایسی مبارک گھڑیاں ہماری زندگیوں میں بار بار عطا فرما، اور اِس سے بھرپور استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

❑❖❑

درسِ حدیث (قسط دوم)

شراب تمام بُرائیوں کی جَڑ ہے

ازقلم: مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری، ناظم مدرسہ دارالتوحید، اعلیٰ ہلی بنگلور

خمر کا مفہوم ومصداق:

''شراب کے لیے عربی زبان میں لفظ ''خمر'' استعمال ہوتا ہے، اِس کی جمع ''خمور'' آتی ہے اور خمر کے لغوی معنیٰ ہیں ''ڈھانپنا''۔

خمر کا لفظ تانیث میں زیادہ مستعمل ومشہور ہے، اِسی وجہ سے اس کے آخر میں تائے تانیث بھی آتی ہے، جیسے: **ھٰذہ خمرۃ**، جب کہ مذکر استعمال بھی جائز ہے، جیسے: **ھٰذا خمر**۔

خمر کی لغوی تحقیق:

''خمر'' وہ ہے جو انگوروں کے رَس سے کشید کی جائے، یا یہ عام (جو کسی بھی پھل سے بنائی جائے) ہے، حقیقت میں اسے عموم پر رکھنا ہی زیادہ راجح ہے؛ کیوں کہ جب یہ حرام ہوئی تو مدینہ میں انگوروں سے شراب کا تصور نہیں تھا؛ بلکہ وہ تو کچی کھجوروں سے ہی شراب بناتے تھے۔

خمر کے لغوی اور شرعی معنیٰ میں مناسبت:

(۱) شراب پر لفظ ''خمر'' کا اطلاق اِس وجہ سے ہے کہ شراب کشید کرنے کے لیے برتن کے منھ کو اُوپر سے ڈھانپا جاتا ہے، حتیٰ کہ اس میں اُبال اور جوش کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

(۲) عقل پر چھا جانے اور شعور کو ڈھانپ دینے کی وجہ سے یہ لفظ اس کے لیے مستعمل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خمر میں یہ دونوں سبب موجود ہیں، شراب کو جوش مارنے اور تیار ہونے تک ڈھانپ کر رکھا جاتا ہے، پھر اس کو پینے پر عقل وشعور میں اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے اور یہ عقل کو ڈھانپ دیتی ہے؛ لہٰذا خمر کو ان دونوں معانی میں استعمال کرنے پر اہلِ لغت کے یہاں کوئی مانع نہیں۔

''خمر'' کی شرعی حقیقت:

خمر کے لغوی معنیٰ اور شرعی استعمال میں کچھ اختلاف کی بنا پر فقہاء کے درمیان خمر کی حقیقت میں دو اقوال پائے جاتے ہیں:

پہلا قول:

''خمر'' صرف وہ ہے جو آگ پر پکائے بغیر انگوروں کے رَس سے کشید کی جائے، جب وہ طبعی حرارت سے اُبلنے اور جوش مارنے لگے اور اس کے اوپر جھاگ آجائے۔ یہ امام ابوحنیفہ (م ۱۵۰ھ) اور بعض شافعی فقہاء کا موقف ہے۔

دوسرا قول:

ہر نشہ آور مشروب کو ''خمر'' کہتے ہیں، خواہ وہ انگوروں کے رَس یا خشک انگور کو پانی میں بھگو کر بنائی جائے، اسے آگ پر پکایا جائے یا بغیر آگ کے اس میں نشہ پیدا ہو جائے، یہ جمہور علماء کا موقف ہے۔

درحقیقت خمر کی تعریف واطلاق میں فقہاء کے مابین اس اختلاف کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جامع تعریف کر کے ہمیں مکلّف اور لاحاصل اختلاف سے بے نیاز کر دیا ہے، سیّدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ'' (ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے)۔

سیّدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: دو طرح کے مشروب جو ہم یمن میں استعمال کرتے تھے: ایک البِتْعجو شہد سے بنتا ہے، حتیٰ کہ اُس میں جوش پیدا ہو جاتا ہے اور دوسرا المِزْرُ جو مکئی اور جَو کو پانی میں بھگو کر تیار ہوتا تھا؛ حتیٰ کہ اس میں نشہ پیدا ہو جاتا، ان کے متعلق میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا تو (جوامع الکلم) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ'' (ہر نشہ آور چیز حرام ہے)۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعریف کے ذریعے ہر نشہ آور چیز کو ''خمر'' کا نام دیا ہے؛ لہٰذا مسکرات کی بعض انواع کو خمر کا نام دے کر دیگر (انواع) کو اس سے خارج کر دینا غلط فہمی اور ایک عام لفظ کو بلا دلیل خاص کر دینا ہے، مزید برآں اس مسئلہ میں وارد احادیث بھی اس موقف کو باطل کر دیتی ہیں کہ خمر صرف انگوروں سے بنائی ہوئی شراب کے ساتھ خاص ہے۔ ان احادیث میں سے چند ایک ملاحظہ ہوں:

(۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ:

''إِنَّ الْخَمْرَ حُرِّمَتْ، وَالْخَمْرُ يَوْمَئِذٍ الْبُسْرُ وَالتَّمْرُ''

''شراب حرام ہوئی تو ان دنوں کچی پکی کھجوروں سے ہی شراب بنائی جاتی تھی''۔

(۲) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی روایت ہے کہ:

''لَقَدْ أَنْزَلَ اللّٰهُ الْآيَةَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ فِيهَا الْخَمْرَ وَمَا بِالْمَدِينَةِ شَرَابٌ يُشْرَبُ إِلَّا مِنْ تَمْرٍ''.

''جب اللہ تعالیٰ نے تحریمِ خمر کی آیت نازل فرمائی تو اُس وقت مدینہ میں کھجوروں کی شراب ہی نوش کی جاتی تھی''۔

ایک روایت کے الفاظ ہیں:

''وَمَا نَجِدُ –يَعْنِي بِالْمَدِيْنَة– خَمْرَ الْأَعْنَابِ إِلَّا قَلِيْلًا، وَعَامَّةُ خَمْرِنَا اَلْبُسْرُ وَالتَّمْرُ''.

''ہمارے پاس مدینے میں انگوروں کی شراب بہت کم تھی؛ بلکہ عام طور پر ہمارے یہاں کچی پکی کھجوروں سے ہی شراب بنتی تھی''۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ:

''نَزَلَ تَحْرِيْمُ الْخَمْرِ وَإِنَّ فِي الْمَدِيْنَةِ يَوْمَئِذٍ لَخَمْسَةَ أَشْرِبَةٍ، مَافِيْهَا شَرَابُ الْعِنَبِ''.

''جب شراب حرام ہوئی تو اس وقت مدینہ میں پانچ قسم کی شراب تیار ہوتی تھی، اور اُن میں انگوروں کی شراب نہیں تھی''۔

(۴) حضرت نعمان بن بشیر روایت کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''گندم، جَو، خشک انگور، کھجور اور شہد، اِن میں سے ہر ایک سے شراب بنتی ہے''۔

(۵) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ: حضرت عمر نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا:

''أَمَّا بَعْدُ! نَزَلَ تَحْرِيْمُ الْخَمْرِ وَهِيَ مِنْ خَمْسَةٍ: اَلْعِنَبِ وَالتَّمَرِ وَالْعَسَلِ وَالْحِنْطَةِ وَالشَّعِيْرِ، وَالْخَمْرُ مَاخَامَرَ الْعَقْلُ''.

''شراب حرام ہو چکی اور وہ پانچ اشیاء سے تیار ہوتی ہے: انگور، کھجور، شہد، گندم اور جَو؛ لہٰذا ہر وہ چیز خمر ہے جو عقل پر پردہ ڈال دے''۔

مندرجہ بالا احادیث اِس بات کی دلیل ہیں کہ انگوروں کے علاوہ دیگر اشیاء پر بھی ''خمر'' کا اطلاق باعتبار لغت صحیح ہے۔ قرآن میں ''خمر'' کی تحریم سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے یہی سمجھا ہے؛ اِس لیے انگوروں کے علاوہ دیگر اشیاء سے تیار کردہ شراب کو ''خمر'' کے حکم میں قیاساً داخل کرنا محض تکلف ہے۔

شراب نوشی حرام ہے، چاہے کم ہو یا زیادہ:

شارح نے ایک قطرہ شراب بھی حرام قرار دی ہے؛ اگرچہ اس سے کوئی زیادہ فساد ظاہر نہیں ہوتا؛ لیکن یہ زیادہ پینے کا ذریعہ بن سکتی ہے؛ لہٰذا یہ سدِ ذریعہ کے طور پر حرام ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَام، وَمَا أَسْكَرَ كَثِيْرُهُ فَقَلِيْلُهُ حَرَام''.

''ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور جو چیز زیادہ مقدار میں نشہ پیدا کرے اُس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے''۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ، وَمَاأَسْكَرَ الْفَرْقُ مِنْهُ فَمِلْأُ الْكَفِّ مِنْهُ حَرَامٌ''.

''ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور جس چیز کا ایک فرق نشہ پیدا کرے، اُس کا چلّو بھر بھی حرام ہے''۔

چرس، افیون اور دیگر منشیات حرام ہیں، شراب کی طرح اِن میں بھی حدّ لگے گی:

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَام''.

''ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے''۔

یہ حیثیت ہر نشہ آور چیز کو شامل ہے، چاہے وہ نشہ آور کھانے کی چیز ہو یا پینے کی، جامد ہو یا مائع، اگر وہ شراب کی تاثیر رکھتی ہے تو حرام ہے، اگر کوئی حشیش، چرس وغیرہ کو مائع شکل میں ڈھال کر پی لے تو وہ بھی حرام ہوگا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جوامع الکلم سے متصف تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا جامع لفظ بولتے جو استعمال کے اعتبار سے عام اور اپنے مفہوم میں شامل تمام اشیاء پر مشتمل ہوتا، چاہے وہ آپ کے زمانہ میں موجود ہوں یا نہ ہوں۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم (جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں کسبِ علم وفیض کرتے رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو اُن سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا) اُن کا بھی یہی کہنا ہے: ''اَلْخَمْرُ مَاخَامَرَ الْعَقْلُ'' (یعنی شراب وہ ہے جو عقل کو ڈھانپ دے)۔

مزید برآں عقل صحیح اِس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ فرضِ محال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہر نشہ آور چیز کو خمر کا نام دینے میں شامل نہ بھی ہوں، تاہم قیاسِ صحیح وصریح جس میں اصل وفرع ہر اعتبار سے برابر ہوں، تو اس کا فیصلہ یہی درست ہے کہ مُسکر کی تمام انواع واقسام ایک ہی حکم میں داخل ہیں؛ لہٰذا ان انواع میں فرق کرنا متماثلین کے درمیان فرق کرنے کے قبیل سے ہوگا اور یہ عقل وقیاسِ صحیح کے خلاف ہے۔ اِس پر منشیات کی تمام (چرس، افیون، ہیروئن وغیرہ) حرام ہیں اور ان پر خمر (شراب) کا نام صادق آتا ہے؛ کیوں کہ نشہ آور ہیں اور عقل ماؤف کر دیتی ہیں، فاسق وفاجر لوگ سرور ومستی کی کیفیت طاری کرنے کے لیے اُنہیں استعمال کرتے ہیں اور یہی اوصاف شراب میں پائے جاتے ہیں۔

مذاہبِ اربعہ اور دیگر فقہاء نے بالاتفاق ان کے حرام ہونے کی صراحت کی ہے؛ لیکن ان کے خیال میں اس کے قلیل استعمال (جس میں نشہ نہ ہو) میں حرمت نہیں؛ بلکہ نشہ آور مقدار کا استعمال حرام ہے؛ حالاں کہ تحقیق اِس بات کی متقاضی ہے کہ ان منشیات کے حرام ہونے پر اتفاق کے بعد، نصوصِ کتاب وسنت کے تحت اُن پر ''خمر'' کا اطلاق ہوتا ہے، اِن کو خمر سے الگ حکم دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ ان میں شراب کے مفاسد جیسا کہ عقل میں فساد، بے ہودگی اور سرور وبدمستی کے علاوہ دین، عقل، اخلاق اور مزاج میں نقصان واضح نظر آتا ہے؛ بلکہ یہ انسان کی طبیعت ومزاج کو پاگل پن کی حد تک متاثر کرتے ہیں اور ان کو استعمال کرنے والا گراوٹ وپستی اور ذلت میں شراب نوشی کرنے والے سے بھی نیچے جا گرتا ہے؛ چوں کہ ان کے مفاسد اور نقصانات شراب سے بڑھ کر ہیں؛ لہٰذا یہ بالاولیٰ حرام ہیں اور ان کو ''خمر'' کا نام دینا بالکل صحیح ہے اور ان کی قلیل مقدار بھی کثیر کی طرح حرام ہے اور ان کے استعمال کرنے والے کو حد خمر لگے گی۔

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) کا کہنا ہے:

''شریعت کا قاعدہ ہے کہ وہ حرام اشیاء جن میں انسانی نفوس رغبت رکھتے ہیں، اُن کے ارتکاب پر حد لازم ہے جیسا کہ شراب اور زنا اور جس میں رغبت نہیں جیسا کہ مردار کا استعمال تھا، اس میں تعزیر ہے، چرس اور افیون اُن اشیاء سے تعلق رکھتی ہیں جن میں ان کے استعمال کرنے والے رغبت اور خواہش رکھتے ہیں اور اسے چھوڑ نہیں سکتے، تو اس کے استعمال پر بھی حد لگے گی، برخلاف بھنگ وغیرہ کے، جو کہ بغیر نشہ کے عقل کو فاسد کرتے ہیں اور لوگوں کو اس میں خواہش اور رغبت نہیں ہوتی، تو اس کے استعمال پر تعزیر ہے''۔

اللہ تعالیٰ قومِ مسلم کے نوجوانوں کو نشہ کے استعمال سے محفوظ رکھے۔ آمین

اصلاحِ معاشرہ (قسط سوم)

دینی وتہذیبی شناخت کی حفاظت

وقت کا اہم مسئلہ

ازقلم: فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

دوسری طرف مختلف جہتوں سے ہندو مذہبی افکار اور تہواروں کا تقدس سرکاری طور پر ذہن میں بٹھایا جارہا ہے، اسکولوں میں مشرکانہ ترانہ ''وندے ماترم'' پڑھنے پر زور دیا جارہا ہے، اسکولوں میں گیتا کی تعلیم کو لازم کیا جارہا ہے، اوراس کو نیشنل بک قرار دیا جارہا ہے، یوگا کے نام پر ''سوریا نمسکار'' اور ہندوانہ تہذیب پر مسلمانوں کو مجبور کیا جارہا ہے، بھارت ماتا کی مورتی بنائی جارہی ہے، اوراس کی جے کار لگائی جارہی ہے، نہ صرف گائے کو مقدس جانور کے طور پر پیش کیا جارہا ہے؛ بلکہ اس کے گوبر اور پیشاب کو بھی اشیائے تبرک کا رنگ دیا جارہا ہے، سرکاری تقریبات میں ہندو علامتی اشیاء کا استعمال ہورہا ہے، جس کا بھرپور مظاہرہ پارلیمنٹ کے افتتاح کے موقع پر ہوا، عمارتوں کو بھی قدیم ہندو طرزِ تعمیر پر ڈیزائن کیا جارہا ہے، ہندو دھرم کی نسبت سے سنسکرت زبان کو مسلط کرنے کی کوشش ہورہی ہے، اسکولوں میں مسلمان طلبہ وطالبات سے سرسوتی پوجا کرائی جارہی ہے، تعلیمی اداروں میں دُرگا پوجا کا تہوار رکھا جارہا ہے، آیورویدک دواؤں کو ہندو مذہبی تعلیمات کے طور پر پیش کرکے فروغ دینے کی جان توڑ کوشش ہورہی ہے، فلموں کے ذریعہ ہندو دیویوں دیوتاؤں کی عظمت ظاہر کی جارہی ہے، اور بہت افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی یہ منظّم سازشیں کسی حد تک رنگ بھی لا رہی ہیں، ہندو تہواروں میں مسلمانوں کی شرکت، غیر مسلم لڑکوں کے ساتھ مسلم لڑکیوں کی شادی، مسلمانوں کے زیرِ انتظام اسکولوں میں ہندو شعائر کی پذیرائی، یہاں تک کہ لباس وپوشاک اوراس سے آگے بڑھ کر مکانات کے کلر میں زعفرانی رنگ کا استعمال، یہ ساری چیزیں وہ ہیں جو مسلمانوں کو اکثریت کی فکر اور تہذیب کی طرف لے جارہی ہیں، اب تو بہت سی جگہ مسلمان ہندو تہواروں میں جلوسوں کا استقبال بھی کررہے ہیں، مورتیوں اور پجاریوں کو ہار پہنا رہے ہیں، برقعہ پوش خواتین گنیش کے منڈپ میں جاکر بیٹھ رہی ہیں اور مندروں میں جاکر نذرانے پیش کررہی ہیں، یہاں تک کہ گزشتہ دنوں برادرانِ وطن کے ایک تہوار میں مولوی صورت اور مولوی لباس نام نہاد

مسلمانوں کا ہاتھ باندھ کر مورتی کے سامنے کھڑا ہونا اور مشرکانہ کلمات ادا کرنا سوشل میڈیا کے ذریعہ تمام لوگوں تک پہنچ چکا ہے، جس پر خون کے آنسو رویا جائے تب بھی کم ہے، یہ کچھ معمولی واقعات نہیں ہیں، یہ دو چار مسلمانوں کی شہادت سے کہیں بڑھ کر ہیں، یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے، جب کوئی قوم اپنے مذہب اور تہذیب کے بارے میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہے تو پھر آہستہ آہستہ اُس کا اپنی پہچان سے محروم ہو جانا دشوار نہیں ہوتا، پہلے تہذیبی انضمام کی نوبت آتی ہے، پھر مذہبی ارتداد کا طوفان آتا ہے؛ اس لیے ہمیں اِس پہلو پر بہت گہرائی کے ساتھ غور کرنے اور اس فتنہ کا سدباب کرنے کی ضرورت ہے۔

اِس سلسلے میں چند باتیں جو بہت اہم نظر آتی ہیں، اور جن کو انجام دینے میں علماء بنیادی رول ادا کر سکتے ہیں، اُن کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱- کوشش ہونی چاہیے کہ کوئی مسلمان لڑکا یا لڑکی بنیادی دینی تعلیم سے محروم نہ رہ جائے، اس کے لیے زیادہ سے زیادہ مکاتب قائم کیے جائیں، چاہے یہ صباحی یا مسائی مکاتب ہوں، یا مغربی ملکوں کی طرح اتوار کو ہفتہ وار مکتب کا نظم ہو، اِسی طرح عصری تعلیم کے کسی پُرکشش مضمون، جیسے انگریزی، حساب یا سائنس کے ساتھ لازمی طور پر بنیادی دینی تعلیم کو شامل کرتے ہوئے کوچنگ سینٹر قائم کیے جائیں، ہمارے یہاں مکتب کے روایتی نظام میں کچھ ماثور اذکار اور چند پاروں کا ناظرۂ قرآن پڑھایا جاتا ہے، اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا؛ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس تعلیم میں ایمانیات کو شامل کیا جائے، خاص کر توحید، شرک والحاد، انسانی زندگی کے لیے نبوت کی ضرورت، ختمِ نبوت کا عقیدہ اور جزا وسزا کا اسلامی تصور، اور اس کے مقابلہ تناسخ (جو تمام ہندوستانی مذاہب کا تقریباً مسلمہ عقیدہ ہے) کا غلط ہونا اور اس کا انسانی زندگی میں صالح انقلاب پیدا کرنے کے لیے ناکافی ہونا واضح ہو جائے۔

۲- زیادہ سے زیادہ اسلامی اسکولوں کا قیام، جس میں مسلمان بچوں اور بچیوں کے لیے اسلامیات کی تعلیم لازمی ہو، اُن کے یونیفارم پُرکشش ہوں؛ مگر شریعت کے دائرہ میں ہوں، مڈل کلاس کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کی جداگانہ تعلیم کا نظام ہو، خواہ اسکول ہی الگ ہو جو سب سے بہتر طریقہ ہے، یا کم از کم کلاس روم الگ ہو، اور آخری درجہ یہ ہے کہ کلاس روم میں لڑکوں اور لڑکیوں کی صفوں کے درمیان ایک چھوٹی دیوار ہو اور آمد ورفت کے راستے الگ ہوں، اکیڈمی اپنے ۲۷ رویں سیمینار منعقدہ ممبئی میں اِس سلسلہ میں تفصیلی تجویز منظور کر چکی ہے۔

۳- تعلیم اور ملازمت کے لیے جس امتحان اور ٹیسٹ (Test) کی ضرورت ہو، اُس کے لیے کوچنگ کا انتظام کیا جانا چاہیے، اگر دینی مدارس بشرط گنجائش اپنے کیمپس میں نہ نفع نہ نقصان کی اساس پر فیس لے کر ایسے

کوچنگ سینٹر قائم کریں گے تو نہ صرف اعلیٰ تعلیم میں مسلمان لڑکے آسکیں گے اور نہ صرف ان کو ملازمت کے بہتر مواقع مل سکیں گے؛ بلکہ ساتھ ہی ساتھ اسلامی ماحول کی وجہ سے اُن کے اندر دین کی عظمت اور اپنی شناخت کی حفاظت کا جذبہ بھی پیدا ہوگا، اور سرکاری تعلیمی اداروں میں جن مشرکانہ افکار واعمال پر ان کو مجبور کیا جاتا ہے، یا ان سے مانوس کیا جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو اس سے محفوظ رکھ سکیں گے۔

۴-موجودہ دَور میں اسکل ڈیولپمنٹ (Skill Development) اور فنی تعلیم کی بہت اہمیت ہے، جس کے ماہرین کی ضرورت ہر جگہ پڑتی ہے، ہندوستان میں ہنرمندوں کی تعداد ضرورت کے اعتبار سے بہت کم ہے، اور بیرون ملک میں اس کی بہت طلب ہے، اس کے ذریعہ صِفر سرمایہ سے انسان اپنے کاروبار کو شروع کرسکتا ہے، اور کم تعلیم یافتہ نوجوان بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، جو پرائیویٹ ادارے ہیں، وہ اِس کام کو کمرشیل بنیاد پر کرتے ہیں اور اس میں دینی تربیت کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا، اگر مذہبی تنظیمیں اور مدارس ایسے ادارے اور تربیتی مراکز قائم کریں، جن میں نسبتاً کم اخراجات ہوتے ہیں، تو اس سے مسلمانوں کو روزگار فراہم کرنے میں بڑی مدد ملے گی، اور وہ معاشی اعتبار سے خود مکتفی ہوسکیں گے، اور جب معاشی اعتبار سے خود مکتفی ہوں گے تو ارتداد کی رو میں بہنے سے بچ سکیں گے۔

۵-انسان جن باتوں کو بار بار سنتا ہے، وہ اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، ذرائع ابلاغ اسی اُصول پر کسی نقطۂ نظر کے موافق یا مخالف فضا بناتے ہیں؛ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں حاصل اور میسر ذرائع ابلاغ کا استعمال فرمایا، آپ کعبۃ اللہ کے صحن سے بھی اہلِ مکہ کے سامنے توحید کی دعوت پیش کرسکتے تھے؛ لیکن آپ نے صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر اپنی دعوت پیش کی؛ کیوں کہ اُس وقت تمام اہلِ مکہ تک اپنی دعوت پہنچانے کا یہی سب سے موثر ذریعہ تھا، پھر آپ نے پورے جزیرۃ العرب تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے حج کے مبارک اجتماع اور بعض تجارتی میلوں کا سہارا لیا؛ حالاں کہ اُس وقت یہ اجتماعات بعض منکرات سے خالی نہیں ہوتے تھے؛ کیونکہ ان ہی اجتماعات کے ذریعہ ایک دوسرے سے پورے جزیرۃ العرب میں بات پہنچ جاتی تھی، پھر جب صلح حدیبیہ ہوگئی، مسلمانوں کو کچھ لمحات سکون کے میسر آئے؛ نیز اس کے بعد جب مکہ مکرمہ فتح ہوگیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرۃ العرب سے باہر جہاں تک سفارت کاری کے ذریعہ اسلام کی دعوت پہنچائی جاسکتی تھی، اس کی بھرپور کوشش کی، یہاں تک کہ بعض مؤرخین کے بیان کے مطابق چین تک آپ کے نمائندہ پہنچے، اس سے میڈیا کی اہمیت اور اسلام کی نظر میں اس کی وقعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں اور موجودہ حالات میں اسلام اور مسلمانوں کو میڈیا جس درجہ نقصان پہنچا رہا ہے، شاید ہی

کوئی اور طاقت اتنا نقصان پہنچا رہی ہو، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس میدان میں ہم اتنے پیچھے ہو چکے ہیں کہ ہمارے لیے اپنے بدخواہوں کی برابری میں آنا ناممکن سا نظر آتا ہے؛ لیکن بحیثیت مسلمان ہمارا فرض ہے کہ ہم جتنا کر سکتے ہیں، ضرور کریں۔

اِس وقت سوشل میڈیا (Social Media) کا ایک ایسا دروازہ کھلا ہے، جو ایک سمندر کی طرح ہے، جس میں گندگیاں بھی ہیں اور صاف وشفاف پانی بھی، اور ہر شخص اُس میں اُتر کر طبع آزمائی کر سکتا ہے، آج کل سوشل میڈیا کے مختلف وسائل کے ذریعہ مؤثر انداز میں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک بات پہنچائی جاسکتی ہے، اپنے یوٹیوب چینلس (Channels) قائم کیے جاسکتے ہیں، ٹی وی ڈیبیٹ میں جو زہر پھیلایا جاتا ہے، یوٹیوب اور ویڈیوز کے ذریعہ اُس کا جواب دیا جاسکتا ہے، اس پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے، ادھر ماشاء اللہ نوجوان علماء نے بھی بہت سے یوٹیوب چینل قائم کیے ہیں؛ لیکن زیادہ تر وہ روایتی پروگرام پیش کرتے ہیں، اور بعض دفعہ تو مسلکی لڑائی کے لیے اس کا استعمال کیا جاتا ہے، ضرورت اِس بات کی ہے کہ اسلام مخالف چینلوں کے سوالات سامنے رکھ کر کم از کم یوٹیوب چینلوں کے ذریعہ ان کا جواب دیا جائے، جو لوگ سوشل میڈیا میں سرگرم ہیں، وہ باہمی ارتباط کے ذریعہ ایسے پروگراموں کو زیادہ سے زیادہ پھیلائیں، اور جو مسلمان نوجوان آئی ٹی کی دنیا سے تعلق رکھتے ہوں، ان کی تربیت کی جائے کہ جو پروگرام اسلام کی مخالفت میں آئے، وہ بڑے پیمانے پر اس پر تردیدی کامنٹ (Comment) دیں، اور جہاں اس سوال کا صحیح جواب مل سکتا ہو، اس کا حوالہ دیں، مقرر کے جھوٹ کو واضح کرتے ہوئے اس سے دلیل طلب کریں، اس طرح ہم مسلمانوں کی نئی نسل کو ارتدادی فکر سے بچا سکتے ہیں، اور بہت سے برادران انسانیت کی غلط فہمیوں کو دُور کیا جاسکتا ہے، فی الحال اِس طرح ہم ایک حد تک میڈیائی یلغار کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اور اگر مسلمان اس میں دلت چینلوں سے رابطہ کرلیں اور اُن سے بھی استفادہ کی راہ نکال لیں تو یہ کوشش اور زیادہ مؤثر ہو جائے گی۔

۶- مسلمانوں کے اندر فرقہ بندی اور اختلاف کا افسانہ ہمارے دشمن بھی مزے لے لے کر سناتے ہیں، اور ہم بھی نمک مرچ لگا لگا کر اس کو آگے بڑھاتے ہیں؛ بلکہ اپنے اختلافات کو میڈیا میں قوت اور مبالغہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں، کم از کم جن ملکوں میں ہم اقلیت میں ہیں، وہاں ہمیں ایسے رویے سے پرہیز کرنا چاہیے، اور اپنے اختلافات کو درسگاہوں تک اور جب عوام سوال کریں تو فتاویٰ تک محدود رکھنا چاہیے، اور اس میں بھی اعتدال کا لحاظ ہونا چاہیے؛ کیوں کہ اس وقت فرقہ پرست طاقتیں مسلمانوں کے آپسی اختلاف کو بڑھاوا دینے کی پوری کوشش میں لگی ہوئی ہے، ایسے موقع پر اعراض کا راستہ اختیار کرنا بہتر ہوتا ہے، ہمیں دوسری قوموں سے سبق

حاصل کرنا چاہیے، برادرانِ وطن کے فرقوں کی تعداد بے شمار ہے، اور فکر وعمل کے اعتبار سے ان کے درمیان اتنی دُوریاں ہیں، جیسے دریا کے دو کنارے؛ لیکن مسلمانوں کی مخالفت کی بنیاد پر اور مسلمانوں کا خوف دلا کر قوم کو متحد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، عیسائیوں کے عام طور پر تین فرقے مشہور ہیں؛ لیکن شاید آپ کو یہ جان کر حیرت ہو کہ حقیقت میں ان کے تین سو سے زیادہ فرقے ہیں، جن کے درمیان شدید اعتقادی وفکری اختلاف ہے؛ مگر وہ اپنے اختلافات کو عوام میں لانے سے بچتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ اس وقت بہت چوکسی اور جہدِ مسلسل کی ضرورت ہے، مسلمانوں کو برادرانِ وطن کی مذہبی تقریبات میں شرکت سے روکنے کی، ایسے تہذیبی تشبہ سے منع کرنے کی جس سے کسی گروہ کی شناخت متعلق ہو، شعائرِ کفر سے بچانے کی، اسلامی شناخت پر ثابت قدم رکھنے کی، توحید وشرک کی سرحدوں کو اچھی طرح سمجھانے کی، شرک کی مختلف قسموں اور بالخصوص مشرکانہ اعمال کو واضح کرنے اور اپنی پہچان کی حفاظت کرتے ہوئے برادرانِ وطن کے ساتھ تعلقات کو استوار کرنے کی ضرورت ہے، اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ نئی نسل کا ایک بڑا حصہ پہلے تہذیبی ارتداد پھر اسلام کے روایتی اعمال پر قائم رہتے ہوئے فکری ارتداد اور آخر میں خدانخواستہ معلنہ ارتداد تک پہنچ جائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔

اصلاحِ معاشرہ

علمائے کرام کا مقام ومرتبہ اور اُن کی ذمہ داریاں

ازقلم: مفتی محمد اسلم صاحب رشادی مدظلہٗ، بانی ومہتمم جامعہ غیث الہدیٰ، بنگلور

ایمان اور علم کائنات کی دو بڑی نعمتیں ہیں

اللہ جل جلالہٗ وعم نوالہٗ کا احسان وکرم ہے، اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو اِس پوری کائنات کی جو دوسب سے بڑی نعمتیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے وہ دونوں نعمتیں ہمیں نصیب فرمائی ہیں، اِس کائنات میں ایمان سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہے، اللہ نے ایمان کی وہ دولت بھی دی ہے، ایمان کے بعد سب سے بڑی نعمت علم ہے، اللہ نے ایمان کے بعد علم سے بھی نوازا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''بخاری شریف'' میں سب سے پہلے ''کتاب الایمان'' قائم فرمایا ہے، اس کے بعد ''کتاب العلم'' پیش فرما کر اشارہ کیا ہے کہ ایمان کے بعد سب سے بڑی نعمت علم ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے ''کتاب العلم'' کے پہلے باب ''باب فضل العلم'' میں آیتِ شریفہ پیش کی ہے:

﴿یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ، وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾ (المجادلہ:۱۱)

اللہ جل شانہٗ اہلِ ایمان کے مقام ومرتبے کو بہت بلند فرمائیں گے، عام اہلِ ایمان میں سے اہلِ علم کا مرتبہ ومقام ان سے بھی اونچا اور بلند فرمائیں گے، اللہ کا کرم ہے کہ اللہ نے ہمیں ایمان کے ساتھ علم کی دولت بھی عطا فرمائی۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے علماء میں ہمارا شمار ہوتا ہے، اِس امت کے علماء کا مقام ورتبہ اور بھی زیادہ اونچا اور بلند ہے، ایک مشہور حدیث ہے جس کو حضراتِ علماء نے معنیً مقبول اور لفظاً موضوع قرار دیا ہے۔

''عُلَمَاءُ أُمَّتِي كَأَنْبِيَاءِ بَنِي إِسْرَائِيلَ''

یہ حدیث اپنے معنیٰ کے اعتبار سے مقبول ہے، لفظاً وارد نہیں ہے، علماء نے موضوع قرار دیا ہے۔

(قال ابن حجر والزركشي، والزرقاني والقاري وغير ذٰلک من المحدثين: لاأصل له، وأورده الرازي في تفسير الكبير واستدل به، وقال ابن عثيمين: علماء أمتي كأنبياء بني إسرائيل، معناه صحيح ولٰكنه ضعيف من حيث أنه مسند إلى النبي صلّى اللّٰه عليه وسلم)

علماء أمتي كأنبياء بني إسرائيل، قال بعضهم: هٰذا الحديث لاأصل له، ولٰكن معناه صحيح لما تقرّر أن العلماء ورثة الأنبياء. (حاشیۃ الطحطاوی علیٰ مراقی الفلاح)

ایک بزرگ نے اپنا خواب بیان کیا ہے: اُنھوں نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خواب میں دیکھا کہ ان دونوں کے درمیان گفتگو ہورہی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: آپ نے آپ کی امت کے علماء کو انبیاء کے برابر قرار دیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے آپ میری امت کے ایک عالم سے بات کرلیں، یہ کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے امام غزالیؒ کو پیش فرمایا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے امام غزالیؒ سے سوال کیا، تمہارا نام کیا ہے؟ امام غزالیؒ نے جواب دیا: محمد بن محمد بن محمد بن احمد الخ، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں نے آپ کا نام دریافت کیا تھا، شجرۂ نسب معلوم نہیں کیا، امام غزالیؒ نے عرض کیا: میں نے آپ کی سنت پر عمل کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ سے سوال کیا:

﴿وَمَاتِلْکَ بِیَمِیْنِکَ یٰمُوْسٰی ○﴾

آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ ھِیَ عَصَایَ، اَتَوَکَّؤُا عَلَیْھَا وَاَھُشُّ بِھَا عَلٰی غَنَمِیْ وَلِیَ فِیْھَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی ○﴾

(طٰہٰ:۱۸)

معلوم ہوا کہ مخاطب معزز ومحترم شخص ہو، تو مختصر سوال کا لمبا جواب دینا چاہیے؛ تاکہ اُس کے ساتھ لمبی گفتگو کی سعادت ملے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مسکرا کر فرمایا: بات صحیح ہے، آپ کی امت کے علماء ہمارے انبیا کے برابر ہیں۔

(ذكره صاحب تفسير روح البيان عن الراغب الأصفهاني في المحاضرات عن صاحب المنام الإمام الشاذلي: تفسير روح البيان، سورة طٰهٰ:۱۸)

اللہ کی بڑی شان ہے کہ اللہ نے اِس امت کے علماء کو بڑا رُتبہ اور مقام دیا ہے، قرآنِ پاک میں ایک واقعہ مذکور ہے۔

عہدِ سلیمانی کے ایک عالِم کتاب کا واقعہ

حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب ہدہد نے بتایا کہ بلقیس قومِ سبا کی ملکہ ہے، اُس کا بڑا تخت ہے، یہ سب

لوگ سورج کی پوجا کرتے ہیں، حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو خط لکھا:

﴿اِنَّـهٗ مِـنْ سُـلَيْـمٰـنَ وَاِنَّـهٗ بِسْمِ اللّٰـهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اَلَّاتَـعْـلُـوْا عَـلَـیَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ○﴾ (النمل:۳۰،۳۱)

سرکشی نہ کرو، فرماں بردار بن کر ہمارے پاس آجاؤ، بلقیس نے اپنے وزیروں اور درباریوں سے مشورہ کیا، کیا کرنا چاہیے؟

بلقیس کے پاس خط جس ہیبت کے ساتھ پہنچا ہے، وہ ہیبت بلقیس کے دل ودماغ پر چھائی ہوئی تھی، بلقیس کے آرام گاہ میں وہ خط سینے پر لاکر رکھا گیا ہے، پوری حفاظت اور سیکورٹی کے باوجود آرام گاہ تک خط پہنچایا گیا ہے، پہنچانے والا بڑی طاقت والا ہے، اُس نے سوچا کہ اِتنی طاقت والوں سے مقابلہ آسان نہیں ہے؛ لہٰذا انہوں نے جیسے کہا، اُس کے مطابق ہمیں اُن کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب خبر ہوئی کہ بلقیس دربار میں حاضر ہونے والی ہے، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے وزیروں سے کہا کہ بلقیس کا تخت جسے عرشِ عظیم کہا گیا ہے، وہ تخت ہمارے پاس حاضر کرو؛ تاکہ بلقیس کو ہماری اقت کا پتہ چلے، آپ نے سوال کیا، کون وہ تخت لائیں گے؟ قرآن میں ارشاد ہے:

﴿قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ﴾ (النمل:۳۹)

جن طاقت ور ہوتا ہے، اس کے باوجود قرآن نے ''عِـفْـرِيْـتٌ مِّنَ الْجِنِّ'' کہا، ایک طاقت ور جن نے عرض کیا: مجلس شروع ہوئی ہے، مجلس ختم ہونے سے پہلے میں تخت آپ کے سامنے حاضر کردوں گا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: اِس سے بھی جلد کون لے آئے گا؟

ایک صاحب کھڑے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اُن کا تعارف کرایا ہے:

﴿قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ﴾ (النمل:۴۰)

ایک صاحب نے جن کے پاس کتاب کا علم تھا، اُنہوں نے پلک جھپکنے سے پہلے تخت حاضر کردوں گا؛ چناں چہ پلک جھپکنے کی دیر میں وہ تخت آگیا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

اِس واقعے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے علماء نے فرمایا: ﴿قَالَ الَّذِيْ الخ﴾ جن کے پاس کتاب کا علم تھا، اُن کی طاقت اِتنی زبردست تھی، اِس کتاب سے کون سی کتاب مراد ہے؟ حضرت سلیمان علیہ السلام سے پہلے زبور، اس سے پہلے تورات نازل ہوئی تھی، ممکن ہے ان دو کتابوں کا علم اُس صاحبِ کتاب کو حاصل ہو؛ لیکن جو حافظِ قرآن ہے، جو عالمِ قرآن ہے، اُس کے پاس کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"أُعْطِيْتُ مَكَانَ التَّوْرَاةِ السَّبْعَ، وَأُعْطِيْتُ مَكَانَ الزَّبُوْرِ الْمَئِيْنَ، وَأُعْطِيْتُ مَكَانَ الْإِنْجِيْلِ الْمَثَانِيَ، وَفُضِّلْتُ بِالْمُفَصَّلِ". (رواه أحمد عن واثلة بن اسقع: ١٦٩٨٢)

ابتدائی سات لمبی سورتیں تورات کی جگہ میں عطا فرمائیں، اس کے بعد کی جو سورتیں سو سے زائد آیتوں پر مشتمل ہیں، اُن کو زبور کی جگہ میں عطا فرمائیں، مثانی سورتیں (جن کی تعداد دوسو کم اور مفصلات کی آیات کی تعداد سے زیادہ ہو۔ شعب الایمان) انجیل کے بدلے میں عطا فرمائیں اور مفصّلات اللہ نے صرف مجھے عطا فرمائی ہیں۔

قرآنِ پاک سابقہ کتابوں کا مجموعہ ہے، جس میں توراۃ، زبورا، انجیل اور قرآنِ مجید سب شامل ہیں، ہم اندازکر سکتے ہیں کہ جن کے پاس صرف ایک کتاب کا علم تھا، ان کی اتنی طاقت ہے، تو جس کے پاس قرآن کا علم ہوگا، اُس کی طاقت کتنی ہوگی؟

طالبِ علم کے لیے نظامِ عالم کی تسخیر

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے جو نعمت ہمیں دی ہے، اُس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہمیں نہیں ہے، اگر ہمیں اُس کا اندازہ ہو جائے، تو ہم خوشی محسوس کریں گے، جوش محسوس کریں گے، اندر کی طاقت کا احساس کریں گے۔

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"إِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا لِطَالِبِ الْعِلْمِ رِضًا بِمَايَطْلُبُ".

(رواه الترمذي عن صفوان بن عسالؓ، كتاب الدعوات: ٣٥٣٥)

طالبِ علم جب حصولِ علم کے لیے نکلتا ہے، تو فرشتے اُس کی خوشنودی کے لیے پَر بچھا دیتے ہیں۔ اِس حدیث کی تشریح میں عام شراحِ حدیث نے یہ لکھا ہے: طالبِ علم حصولِ علم کے لیے نکلتا ہے، تو اُس کے اعزاز واکرام میں فرشتے اپنے پَر بچھا دیتے ہیں۔

جیسے مشہور ہے: Red carpet welcome بڑے لوگوں کا استعمال سرخ قالین بچھا کر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ایک طالبِ علم کے استقبال کے لیے فرشتوں سے کہہ دیا کہ اپنے پَر بچھائیں۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ نے ایک دوسری تشریح فرمائی ہے: اللہ نے اِس کائنات کا تکوینی نظام: سورج کا طلوع ہونا، غروب ہونا وغیرہ فرشتوں کے ذریعے چلایا ہے:

﴿وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ﴾ (الرعد:١٣)

بجلی کی کڑک: بادل کیساتھ ایک فرشتہ چلتا ہے، بادلوں کو ہانکنے کے لیے کوڑا برساتا ہے، اُس کی جو آواز نکلتی ہے، وہ آواز بجلی کی کڑک ہے، یہ سارا نظام اللہ نے فرشتوں کے ذریعے چلایا، حضرت فرمایا کرتے تھے: اللہ جل شانہٗ پورا تکوینی نظام طالبِ علم کے قدموں پر ڈالتے دیتے ہیں، اس طالب کے قدموں پر جس نے ابھی ''الف''، ''با''، ''تا'' شروع نہیں کی ہے، صرف حصولِ علم کا ارادہ کیا ہے، سوچیں وہ حافظِ قرآن بنے گا، وہ عالمِ دین بنے گا، وہ اللہ کے دین کا داعی بنے گا، وہ اللہ کے دین کا علمبردار بنے گا، پھر اُس کا رتبہ، اُس کا مقام، اُس کے ساتھ اللہ کی نصرت و مدد اور اعانت کس درجے ہوگی!

ایک عالم کا فیض ایک عالَم کے لیے

بہرحال اللہ نے ہمیں اُونچا مقام اور بڑا رُتبہ دیا ہے اور ہماری بہت اُونچی شان رکھی ہے؛ لیکن اللہ کا نظام ہے، جن کا رتبہ بڑا ہوتا ہے اُن کی ذمہ داری بھی بڑی ہوتی ہے۔

ایک مشہور محاورہ ہے: جب کسی بڑے بزرگ عالَم کی وفات ہوتی ہے، تو کہا جاتا ہے:

''مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ''

ایک عالم کا دنیا سے رخصت ہونا، عالم کا دنیا سے رخصت ہونا ہے، ایک عالم دنیا سے رخصت ہوتا ہے، تو عالم پر سناٹا چھا جاتا ہے، مذکورہ بالا جملہ اَدھورا ہے، پورا جملہ اِس طرح ہے:

''حَيَاةُ الْعَالِمِ حَيَاةُ الْعَالَمِ، مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ''

ایک عالم کا زندہ رہنا، ایک عالم کا زندہ رہنا ہے، ایک عالم زندہ ہوتا ہے، وہ اپنی حرکت، جدوجہد اور گرمی سے پورے عالم کو گرمی پہنچاتا ہے۔

جنریٹر (بجلی پیدا کرنے والا آلہ) جس کے ذریعے پورے علاقے میں روشنی پہنچائی جارہی ہے، جب وہ خراب ہوجائے، اچانک بجلی چلی جائے، تو پورے علاقے میں اندھیرا چھا جاتا ہے، اندھیرا اچانک نہیں ہوا ہے، ایک زمانے تک روشنی پہنچانے کے بعد اندھیرا ہوا ہے، گویا روشنی پہنچانے والے کا خاموش ہوجانا، پورے زمانے اور علاقے کے لیے اندھیرے کا سبب بنا۔

''حَيَاةُ الْعَالِمِ حَيَاةُ الْعَالَمِ، مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ''

ایک عالم کا زندہ رہنا، پورے عالم کو گرمی پہنچانے کا سبب ہے، عالم کا دنیا سے رخصت ہوجانا، پوری دنیا میں سناٹے کا سبب ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ کی فکر و کُڑھن

اللہ نے ہمیں ذمہ داری دی ہے، اس ذمہ داری کو سامنے رکھ کر ہمیں سوچنا ہے کہ پورے عالم میں کیسے گرمی پہنچائی جائے، حرکت، جدوجہد، کوشش، تڑپنا، بلکنا، بلبلانا جو کیفیات اللہ نے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو عطا فرمائی تھیں، آپ میں بے قراری و بے چینی اِتنی تھی کہ راتوں کی نیند اُڑ گئی، اہلیہ نے پوچھا: رات میں آپ کو نیند نہیں آتی، بیداری میں ساری رات گزر جاتی ہے، کوئی خاص سبب؟ کوئی خاص بات؟ حضرت نے فرمایا: اگر سبب بتاؤں، تو جاگنے والے ایک نہیں، دو ہو جائیں گے۔

حضرت فرمایا کرتے تھے:

شبِ وصل کسی کی سوتے کٹے ہے، کسی کی شبِ فصل روتے کٹے ہے
الٰہی! یہ کیسی شب میری ہے، نہ سوتے کٹے ہے، نہ روتے کٹے ہے

یہ حضرت کی شب تھی، بے چینی، بے قراری اور بے کلی والی۔

حضرت شاہ محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں شاہ عطاء اللہ بخاری رحمہ اللہ حاضر ہوئے، آپ کی محنت، فکر اور کام کو دیکھا اور فرمایا: میرا خیال ہے کہ مجھے آپ کی خدمت میں اپنی جوانی میں آنا چاہیے تھا، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا: آپ جس عمر میں آئے ہیں، وہ بالکل صحیح عمر ہے، جس میں آپ کا خیال ہے کہ میری تقریر، میرے جوش سے کچھ نہیں ہوسکتا، جو کچھ ہوگا، وہ صرف اللہ ہی سے ہوگا۔

یہ عجیب کُڑھن حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ کے اندر موجود تھی، یہ کُڑھن میرے اور آپ کے دلوں کے اندر آجائے، ہمارے پاس ایک امانت ہے، یہ امانت پوری امت تک پہنچانی ہے، امت کے حالات ہم سب کے سامنے ہیں، امت اپنی دنیا بچانے کے لیے اپنے دین کو قربان کر رہی ہے، دنیا بچانے کے لیے اپنا دین بگاڑ رہی ہے، جس دنیا کو بچانے کے لیے کر رہی ہے، اُس کا بچنا بھی مشکل ہے، امت اِس درجہ گہری نیند سوگئی ہے کہ کچھ احساس ہی نہیں ہے، کیا تبدیلیاں ہو رہی ہیں؟ ایک بے حسی کا عالم ہے، اسی کیفیت سے ہم گزر رہے ہیں، دو تین دن سے شہر (بنگلور) میں ایک خبر گشت کر رہی ہے، تقریباً علمائے کرام کو یہ خبر پہنچی ہے کہ ہماری بچیوں کا ایمان محفوظ نہیں ہے، ہماری بچیاں غیروں کے ساتھ بھاگ رہی ہیں۔

خود احتسابی کی ضرورت

ان سب حالات کو دیکھ کر ہمارے بزرگوں کا کہنا ہے ہم سوچیں جو کچھ ہم کر رہے ہیں، وہ سب بڑے کام ہیں،

امامت بڑا کام ہے، خطابت بڑا کام ہے، تدریس بڑا کام ہے، سب نبوی ذمہ داریاں ہیں، سب بڑے کام ہیں، ان میں سے کسی کام کا استخفاف نہیں کیا جاسکتا -نعوذ باللہ۔ جو کام ہو رہا ہے وہ اللہ کا کرم ہے، کتنا باقی ہے؟ اس کو سوچنا ہے، تاجر ہر ہفتہ سوچتا ہے کہ کتنا کما رہا ہوں، کتنا ضائع کر رہا ہوں، اگر نقصان ہو رہا ہو، تو دکان بند کرنی چاہیے۔

امامت سے متعلق احتساب

ہم امامت کر رہے ہیں، تو دیکھنا چاہیے کہ ہماری اقتداء میں نماز پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟ عام طور سے پانچ فیصد ہے، جمعہ میں پینتالیس فیصد اور عیدین میں اَسّی تا پچاسی فیصد نمازی ہوتے ہیں، گوشت والے کو عید کے دن دکان بند کرنے کی فرصت نہیں، کپڑے والے کو دکان بند کرنے کی فرصت نہیں، چپل والے کو دکان بند کرنے کی فرصت نہیں، میں امام ہوں، تو نماز میں حاضر ہونے والے چند افراد کو نماز پڑھادوں، تو میری ذمہ داری پوری ہوگئی؟ بارہ/ پندرہ نمازیوں کا امام ہوں؟ یا پورے محلے کا امام ہوں؟

جمعہ کے خطبے و بیان کی کیا کیفیت ہے؟ عام طور سے جب بیان شروع ہوتا ہے، اُس وقت بارہ/ پندرہ افراد ہوتے ہیں، وہ ری ٹیڈ (وظیفہ یاب) ہوتے ہیں، چند مسجدیں مستثنیٰ ہوسکتی ہیں، نکاح کی اہمیت پر آپ کا پُر جوش بیان چل رہا ہے، جو لوگ سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، اُن کو نکاح کی ضرورت نہیں ہے، مزید اُن پر سکینہ نازل ہو رہی ہے کہ بیان کے بیان کے آخر میں حرکت دے کر جگانے کی ضرورت ہے، جن کو بیان سننا چاہیے، جن کو زندگی بدلنا چاہیے، وہ دیر سے آرہے ہیں، کوئی استنجا خانہ جا رہا ہے، کوئی وضو خانہ جا رہا ہے، سب لوگ اِس انتظار میں رہتے ہیں کہ بیان ختم ہو اور جماعت کھڑی ہو جائے۔

شبِ براءت اور شبِ قدر میں مسجد کے ذمہ دار حضرات ائمۂ کرام سے یہ اعلان کرواتے ہیں کہ نماز کے بعد سڑکوں پر گاڑیاں نہ چلائیں، ویلینگ نہ کریں، جن لوگوں کو سننا ہے، عمل کرنا ہے، وہ لوگ مسجد میں نہیں ہیں، وہ تو نمازِ عشاء سے پہلے ہی نکل چکے ہیں۔

مدارس کا جائزہ

چند سال قبل حکومتِ ہند نے جناب سچر صاحب کی صدارت میں پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی اور معاشی سروے کرایا تھا، کمیٹی نے سروے مکمل کرنے کے بعد سچر کمیٹی رپورٹ پیش کی، اُس رپورٹ میں اِس بات کا بھی ذکر ہے کہ مدارس میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد چار فیصد ہے، یہ تناسب مغربی بنگال، آسام، بہار اور یوپی کے صوبوں کے بشمول ہے، ہمارے علاقے کا تناسب مزید بہت کم ہے، ممکن ہے کہ آدھے فیصد سے کم ہو۔

ہم سب مدرسے والے ہیں، ہمارے مدرسوں میں پڑھنے والے طلبہ کے شوق کو دیکھ کر ہم سمجھتے ہیں کہ ہم خیر القرآن کے زمانے میں تھے، امت کے احوال کو دیکنا ہے کہ جو طلب والے ہیں، اُن کا یہ حال ہے، پچاسی فیصد لوگ نماز سے دُور، پچپن فیصد لوگ جمعہ سے دُور، چھیانوے فیصد مسلم بچے دینی تعلیم سے دُور ہیں، ان سب حالات کو دیکھیں، تو جو ہم کر رہے ہیں، وہ سب قابلِ قدر قابلِ مبارک باد ہے، بڑا کام ہے، جو اللہ ہم سے لے رہا ہے۔

علماء کی قدر اللہ ہی جانتے ہیں

حکیم الملّت حضرت مولانا مفتی اشرف علیؒ فرمایا کرتے تھے:

''امامت ایک ایسا منصب اور ذمہ داری ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور سے بلا کسی تغیر آج تک اسی ترتیب پر باقی ہے، مدارس کا نظام احوال کے اعتبار سے دار الاقامہ، درسِ نظامی وغیرہ کے اعتبار سے تبدیلی آئی ہے؛ لیکن امامت کی ترتیب وہی باقی ہے، یہ بہت بڑا کام ہے، جو اللہ ہم سے لے رہا ہے''۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ سے کسی نے کہا: مدرسے والے لوگوں پر بوجھ بنے ہوئے ہیں اور لوگوں کی زندگیاں برباد کر رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا: اِن بوریہ نشینوں پر تنقید نہ کرو، اِن ہی کے ذریعے ہندوستان میں اسلام زندہ ہے؛ ورنہ میں اندلس دیکھ کر آیا ہوں، چھوٹے چھوٹے مکاتب ختم ہوئے، تو دین سے رشتہ اور تعلق ختم ہو گیا۔

اللہ نے ہمیں ایک ذمہ داری دی ہے، ہم اِس ذمہ داری کو ادا کر رہے ہیں، یہ اللہ کا کرم ہے، اللہ جل شانہٗ اپنے فضل سے لے رہے ہیں، ہم پر کسی کا احسان نہیں ہے، ہم اللہ کا لشکر ہیں، ہم کسی کے ملازم نہیں، کسی کمیٹی کے ملازم نہیں ہیں؛ بلکہ ہم اللہ کے لشکر کا حصہ ہیں، لوگوں کو ہماری قدر کیا معلوم ہے؟ مشہور قول ہے:

''قدرے جوہر شاہ بداند، یا بداند جوہری''

موتی کی قدر و قیمت بادشاہ کو معلوم ہوتی ہے، یا جوہری کو معلوم ہے، عام لوگ اُس کو عام پتھر سمجھتے ہیں۔

ایک شاعر کا واقعہ

ایک شاعر تھے، وہ شعر لکھتے، شعر لکھ کر تکیے کے نیچے رکھ دیتے اور کہتے کہ یہ پانچ ہزار روپئے کا ہے، یہ شعر دس ہزار روپئے کا ہے، یہ شعر پندرہ ہزار روپئے کا ہے، ایک دن گھر میں دودھ کی ضرورت تھی، بیوی نے دکان والے سے کہا: یہ شعر لے لیجیے، ایک لیٹر دودھ دیجیے، دکان دار نے اُس کو لیا اور پھینک دیا۔

ایک بادشاہ شکار کے لیے جنگل گیا، اُس نے جنگل میں شامیانہ (خیمہ) لگایا، تخت سجایا، درباریوں کے لیے دربار لگایا اور تخت پر جلوہ افروز ہوا، ایک شاعر بادشاہ کے محل میں حاضر ہوا اور شعر کہا:

منعم بکوہ و دشت غریب نست
ہر جا کہ رفت، خیمہ زد، دربار ساخت

''محسن اور سخی پہاڑوں اور جنگلات میں اجنبی نہیں ہوتا، جہاں جاتا ہے وہاں خیمہ لگا کر دربار قائم کر دیتا ہے اور سخات شروع کر دیتا ہے''

بادشاہ خوش ہوا اور شاعر کو ایک لاکھ روپئے انعام میں دیا، اگلے دن اگلی منزل پر دربار سجایا گیا، وہ شاعر اُس جگہ بھی حاضر ہو گیا، پھر وہی شعر کہا، بادشاہ نے پھر ایک لاکھ روپئے انعام میں دیے، پھر تیسرے دن اِسی طرح ہوا، پھر ایک لاکھ روپئے شاعر کو انعام میں دیے، اُس شاعر کے بعض حاسدین نے شاعر سے کہا: بادشاہ موڑی ہوتے ہیں، معلوم نہیں کب خوش ہو جائیں اور کب ناراض، پہلے دن تازہ شعر، دوسرے دن باسی شعر، تیسرے دن کھاسی، بادشاہ ناراض ہو جائے، تو پیسہ بھی جائے گا اور جان بھی جائے گی؛ لہٰذا جتنا ملا ہے، اُس کو غنیمت سمجھو اور یہاں سے چلے جاؤ، شاعر چلا گیا، اگلے دن اگلی منزل پر دربار لگا، شاعر نہیں آیا، بادشاہ نے پوچھا: وہ شاعر کہاں ہے؟ درباریوں نے کہا: بادشاہ سلامت! وہ شاعر چلا گیا، بادشاہ نے کہا: سات دن کا میرا سفر تھا، میں نے ارادہ کیا تھا کہ ہر دن ایک لاکھ روپئے انعام دینا ہے، بادشاہ کے پاس ایک شعر سات لاکھ روپئے کا ہے، وہ شعر دودھ والے کے پاس چالیس روپئے کا بھی نہیں ہے۔

ہماری قربانی ہے، مدرسوں میں بچپن کی وہ عمر جو ماں باپ کے ساتھ گزارنی تھی مدرسوں میں گزاری ہے، مشقتیں اُٹھائیں، سوکھا موکھا کھایا، قربانیوں کے ساتھ علم حاصل کیا، اللہ کے پاس اِس کی قدر ہے، اللہ اِس کی قدر کو جانتے ہیں، دنیا والے کیا دے سکتے ہیں؟ اِس لیے ہم اللہ کے لشکر کا حصہ ہیں، ہم کسی کے ملازم نہیں ہیں، ﴿وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾۔

اِس لیے ہم پوری ہمت جٹائیں، پوری طاقت وتوانائی اللہ کے دین کے احیاء کے لیے لگائیں، اللہ نے ہمیں جو ذمہ داری دی ہے، اُس کو پورا کرنے میں لگائیں۔

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ (قسط اوّل)

چار صفات اپنائیں (علم، امانت، قوت، حفاظت)

ازقلم: مولانا محمد اویس صاحب رشادی، استاذ دارالعلوم شاہ ولی اللہ بنگلور

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں بسانے کے بعد اس کے ساتھ کئی ضرورتوں کو جوڑ دیا، وہ اپنی ان ضرورتوں کو حاصل کرنے کے لیے کوششیں کرتا ہے، کبھی رشتہ داروں کے تعاون کی ضرورت پڑتی ہے، تو کبھی انجان لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے، ان سے اپنی ضروریات لینے اور دوسروں کی ضرورتوں کو پوری کرنے کے لیے ان کے ساتھ بود و باش ایک بدیہی امر ہے، ہر مؤمن جانتا ہے کہ دنیا میں آنے کا مقصد اللہ پر ایمان لانا، خلوص دل کے ساتھ اس کی عبادت کرنا، اور عبادت کی راہ سے اس کی معرفت حاصل کرنا ہے؛ چناں چہ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ﴾ انسان کے لیے اپنی ضرورتوں میں گھرے ہوتے ہوئے اپنے پروردگار سے تعلق استوار کرنا بھی نہایت ضروری ہے؛ ورنہ ایک انسان اور جانور میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا اور تعلق مع اللہ کے بغیر مسلمان کا کافر مشرک ملحد سے فرق مشکل ہو جاتا، ان حقوق کی ادائیگی آسان ہونے کے لیے زندگی کے ہر موڑ میں چند صفات کی ضرورت درپیش ہے، اُنھیں صفات کو اِس جگہ پیش کرنا مقصدِ تحریر ہے؛ چناں چہ:

﴿قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْأَرْضِ إِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ○﴾ (یوسف:۵۵)

ملکی خزانہ پر مجھے مامور کردو میں ان کی حفاظت بھی رکھوں گا اور خوب واقف بھی ہوں''۔

ایک اور جگہ ارشادِ ربانی ہے کہ:

﴿قَالَتْ إِحْدٰهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ○﴾

(قصص:۲۶)

''بولی ان دونوں میں سے ایک نے، کہ اے باپ اُس کو نوکر رکھ لے؛ البتہ بہتر نوکر جس کو تو رکھنا چاہے وہ ہے جو مضبوط ہو اور امانت دار ہو''۔

پہلی آیت حضرت یوسف علیہ السلام سے متعلق ہے اور دوسری آیت کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے۔

اِن دونوں آیتوں میں جن چار صفات کو گنوایا گیا ہے وہ یہ ہیں: علم، امانت، قوت اور محافظت۔ علم بھی ضروری ہے، اِس کے نہ ہونے کو جہالت کہتے ہیں، امانت کی ضرورت کا کون انکار کرسکتا ہے، اس کے مفقود ہونے کو

بددیانتی و بے ایمانی سے تعبیر کی جاتا ہے، طاقت وقوت کے بغیر انسان مردنی کی زندگی گزارتا ہے، جس کے اندر حفاظت ومحافظت کا دھیان نہ ہو وہ سماج میں لاپرواہ شمار ہوتا ہے، گویا یہ چاروں صفات اپنے اندر ایک اہمیت رکھتی ہیں، سب مسلمانوں کو اِن کا حامل ہونا، خصوصاً نوجوانوں کو اِن صفات سے متصف ہونا اشد ضروری ہے۔

(۱) علم

علم کی قدر ومنزلت:

صفتِ علم کی قدر وقیمت کا کون انکار کرسکتا ہے؛ کیوں کہ یہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی خاص صفت ہے، اِس علم کی وجہ سے انسان کو اشرف المخلوقات میں شمار کیا گیا، اِسی امتیازی صفت کی وجہ سے انسان دیگر حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے، یہ ہو تو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ ہے اور اگر یہ نہ ہو تو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ بھی نہیں ہے، اِسی علم کی وجہ سے آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر برتری ملی، یہاں تخلیقِ آدم کا واقعہ دُہرالیں، اُس سے علم کی شان اور علم کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کا عالی مقام اور حضرت آدم علیہ السلام کے توسط سے اولادِ آدم کا مقام ومرتبہ واضح ہوتا ہے، تخلیقِ آدم کے موقعہ پر فرشتے انسان کو جنات پر قیاس کرکے بظاہر معترض ہوئے، اُس وقت اللہ نے یہ کہہ کر فرشتوں کو ساکت کردیا کہ: ﴿اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝﴾ لیکن اس کو مبرہن کرنے کے لیے جس راہ کو اپنایا وہ علم ہی کا راستہ تھا، فرشتوں کو اور حضرت آدم علیہ السلام کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کے بعد ملائکہ سے سوال فرمایا: ﴿اَنۡۢبِـُٔوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝﴾ (بقرہ:۳۱) بتلاؤ مجھ کو اسماء اِن چیزوں کے مع اُن کے آثار وخواص کے، اگر تم سچے ہو، یعنی جو سبق پڑھایا گیا تھا وہ سبق مجھے سناؤ، اِس پر فرشتے لاجواب ہوئے، پرچۂ سوال کو حل کرنے سے قاصر رہے، جب آدم علیہ السلام کا نمبر آیا تو اللہ نے سناؤ کہنے کے بجائے فرمایا: ﴿اَنۡۢبِئۡهُمۡ﴾ یعنی آدم! اِن کو بتاؤ، فرشتوں کو سبق سنانے کا حکم ملتا اور حضرت آدم علیہ السلام کو پڑھانے کا حکم ملتا ہے، گویا آدم علیہ السلام استاد ہیں، فرشتے سارے شاگرد۔

حضرت مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ لکھتے ہیں کہ: ''اِس طرزِ بیان کے فرق سے واضح ہوگیا کہ آدم علیہ السلام کو معلّم کا درجہ دیا گیا اور فرشتوں کو طالبِ علم کا، جس میں آدم علیہ السلام کی فضیلت وتفوق کا ایک اہم صورت سے اظہار کیا گیا ہے''۔ (معارف القرآن: ج۱/ص۱۸۲)

اِسی رشتہ کی بنیاد پر فرشتوں کو اپنے استاد کے سامنے سجدۂ تعظیمی بجالانے کا حکم دیا جاتا ہے، جس کو شاگردوں نے بحسن وخوبی انجام دیا، اِس سے اندازہ ہوا کہ یہ علم اور اہلِ علم کا مقام ومرتبہ ہے، آج بھی ایک

شاگرد اپنے استاد کی تعظیم بجالاتا ہے، استاد کی جوتیاں سیدھی کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا ہے، وہ اسی سجدۂ تعظیمی کی ایک جھلک ہے، یہ عظمت ورفعت استاد کو اور اہلِ علم کو علم ہی کی وجہ سے نصیب ہوتی ہے۔ اسکول اور کالجوں میں ممکن ہے کہ تربیت نہ ہونے کی وجہ سے ایسا ماحول نہ ہو؛ مگر مدارسِ دینیہ کے گویا نصاب کا ایک حصہ یہی ادب وعظمت ہے۔

اہلِ علم کا مقام ومرتبہ:

سارے انبیاء، صحابہ، اولیاء، ائمہ ومحدثین علم والے گزرے ہیں، یہ قدسی صفات اشخاص اب اِس دنیا میں نہیں رہے؛ مگر ان کا نام جب بھی لیا جاتا ہے سر جھکنے کو چاہتا ہے اور پلکیں بچھنے کو، قصد بلاقصد زبان پر دعائیہ کلمات جاری ہونے لگتے ہیں، یہ سب علم کی خاطر ہے؛ چناں چہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ: ''ایک مرتبہ عبداللہ بن مبارک رقہ آئے، (خلفائے عباسیہ عموماً رقہ میں گرمی گزارتے تھے، یہ مقام نہایت ہی سرسبز اور شاداب ہے) اہلِ شہر کو اِس کا علم ہوا تو استقبال کے لیے پورا شہر ٹوٹ پڑا، ہارون رشید کی ایک لونڈی محل سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی، اُس نے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ لوگوں نے اُسے بتایا کہ خراسان کے ایک عالم ابنِ مبارک یہاں آئے ہیں، اُنہی کے استقبال کے لیے یہ مجمع اُمڈ آیا ہے، اُس نے بے ساختہ کہا کہ: ''**هو الملك لامُلك لهارون الذي لايجتمع الناس عليه إلا بشرط وأعوان**''. (کردری: ص۱۷۳/) (حقیقت میں خلیفۂ وقت یہ ہیں ہارون نہیں؛ اِس لیے کہ اس کے گرد کوئی مجمع بغیر پولیس، فوج اور اعوان وانصار اکٹھا نہیں ہوتا)۔

دینی علوم ودنیوی فنون:

چاہے دینی علوم ہوں یا دنیوی فنون، ان کے حصول کی کوشش کرنا چاہیے، آج سماج میں اسی کو اہمیت دی جاتی ہے جو علم وفن سے آراستہ ہو؛ اِس لیے جو علم حاصل کرتا ہے اُسے اِس راہ میں پیش آنے والی مشقتوں کو برداشت کر لینا چاہیے؛ تاکہ زندی بھر راحت وآرام میسر ہو، جو طلبہ اس راہ کی مشقتوں کو نہیں جھیلتے، آرام طلبی کے لیے یا چند سکوں کی خواہش کے لیے راہِ فرار اختیار کرتے ہیں اُن کے نصیبہ میں زندگی بھر کی مشقتیں آتی ہیں، کوئی گیریج شاپ کے حوالے ہوتا ہے، تو کوئی پنکچر شاپ کے حوالہ، کسی کو بوجھ ڈھونا پڑتا ہے، تو کسی کو فٹ پاتھ پر جوتے صاف کرنا، ہاں اس کا سبب غربت بھی ہوسکتا ہے؛ لیکن زیادہ تر وہی لوگ مشقتیں جھیلتے ہیں جنھیں تعلیمی اداروں میں چلنا نہیں آیا، **اللّٰھم احفظنا منه**۔

میں طلبۂ عزیز سے- چاہے وہ اسکول کے طلبہ ہوں یا کالج کے، مدارس کے ہوں یا جامعات کے- گزارش کرتا ہوں کہ اپنے علم کو وسیع کریں، میدانِ علم سے کبھی راہِ فرار اختیار نہ کریں، ہم عصری علوم کے ہرگز مخالف نہیں، آپ ڈاکٹر، انجینئر، لایر، بیرسٹر، آئی اے ایس، آئی پی ایس ضرور بنیں؛ مگر اِن سب کے ساتھ مسلمان بھی بننے کی فکر کریں۔ آج امت میں سب کچھ ہے؛ مگر مسلمانی کی کمی ہے، سماج کو صرف ڈاکٹر، انجینئر، لایر، بیرسٹر کی ضرورت نہیں؛ بلکہ مسلمان ڈاکٹر، انجینئر، لایر، بیرسٹر کی ضرورت ہے، ایمان دار آئی اے ایس، آئی پی ایس کی ضرورت ہے، اور ایمانی صفات، قرآن وسنت کے علوم سے آتی ہیں؛ اِس لیے دنیوی علوم وفنون کے ساتھ دینی علم کی طرف بھی توجہ دیں، اِسی میں کامیابی پنہاں ہے۔

مسلم معاشرہ میں علم کی کمی:

اِس امت کو پہلا سبق جو دیا گیا تھا وہ علم اور حصولِ علم کا سبق تھا؛ بلکہ انسانیت کو حضرت آدم علیہ السلام کے توسط سے پہلی دولت علم ہی کی دی گئی تھی، علم ہی انسان کی پہچان ہے، فرشتوں میں افضل فرشتہ جبرئیل، رسولوں میں افضل رسول حضرت سیّدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کتابوں میں افضل کتاب قرآن کا پہلا سبق وہ علم کا سبق ہی لایا تھا؛ چناں چہ ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ○﴾ (علق)

اِن آیات میں مکتب کا علم، مدرسہ کا علم اور جامعات کا علم سب کا تذکرہ ہوگیا، علم کی اِس قدر اہمیت اِسی لیے ہے کہ علم کے بغیر انسان اللہ کو پہچان نہیں سکتا ہے، بے علم جاہل کو شیطان آسانی سے گمراہ کرسکتا ہے؛ اِسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''فَقِیْهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَی الشَّیْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ'' آج جتنے لوگ گمراہ ہوئے بے علمی وجہالت کی راہ سے گمراہ ہوئے؛ لیکن علم کی اِس قدر اہمیت کے باوجود مسلم معاشرہ کی ایک بڑی تعداد علم سے عاری ہے، اس میں نظامِ تعلیم کا بھی دخل ہے، ناتجربہ کار معلّمین کا بھی دخل ہے، لاپرواہ والدین کا بھی حصہ ہے، سرمایہ دار طبقہ بھی اِس کے ذمہ دار ہیں۔

ہمارا تعلیمی نظام اِس قدر سطحی اور کھوکھلا ہے کہ عصری تقاضوں کو پورا کرنے کی اِس میں صلاحیت بالکل نہیں ہے، یا یوں کہو کہ ہمارا اپنا کوئی نظامِ تعلیم ہی نہیں ہے؛ بلکہ ہم لوگ عیسائی مشینری کے محتاج ہیں، صیہونیت سے متاثر ہیں، ماڈلزم کی آڑ میں ہمارے ادارے اسلامیات سے بے بہرہ ہیں، پڑھانے والوں میں صفتِ رحمت ہی نہیں، ان میں ''اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَةُ'' (بخاری) (دین سراسر خیر خواہی کا نام ہے) کا جذبہ موجزن نہیں، اللہ پڑھانے والوں کو ربانی دیکھنا چاہتے ہیں؛ چناں چہ ﴿وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ الْکِتٰبَ وَبِمَا کُنْتُمْ

تَـدْرُسُوْنَ﴾ (آلِ عمران:۷۹) (لیکن تم لوگ اللہ والے بن جاؤ اِس وجہ سے کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور اِس وجہ سے کہ تم پڑھتے ہو)؛ لیکن پڑھانے والے مسندِ درس کو محض معاش کا ذریعہ سمجھتے ہیں، تنخواہ میں اضافہ کی فکر انہیں دامن گیر، بونس کا حصول اُن کے مدنظر، اسکول ومدرسہ کی زمین میں اُن کے لیے رہائش کا انتظام ہوجانا گویا اوّلین حق ہے، جو بچے ان سے متعلق ہیں چاہے وہ غلط صحبت کے عادی ہوں یا غلط عادتوں کی لت اُنھیں لگی ہوئی ہو یا تربیت نہ ہونے کی وجہ سے اسکول وکالج اور مدرسہ کی چہار دیواری میں وہ بتدریج "ضَـلُّوْا فَأَضَلُّوْا" کے مصداق بن رہے ہوں، ذمہ داروں کو اس سے بالکل سروکار نہیں، ایسی صورتِ حال میں کس سے کیا اُمید لگائی جاسکتی ہے۔

مسلم معاشرہ علم سے عاری ہونے کے ذمہ دار وہ والدین بھی ہیں جو باوجود وسعت رکھنے کے اپنے بچوں کی تعلیم کی فکر نہیں کرتے یا فکر تو کرتے ہیں؛ لیکن اپنے بچوں کی صحیح نگرانی نہیں رکھتے، جس کے نتیجے میں بچے آوارہ بن جاتے ہیں، ان بچوں کو پڑھائی کرنے سے زیادہ دلچسپی لڑکیوں سے دوستی کرنے میں نظر آتی ہے، قیمتی بائک میں گھومنا، ہوٹلوں میں وقت گزارنا ان کا پیشہ ہوتا ہے، میدانِ علم میں ناکامی کی صورت میں اگر باپ تاجر ہو تو اُس کی تجارت سنبھالنے کے لیے وہ باپ کا معاون بن جاتا ہے، بصورتِ دیگر کسی عزیز کی کاسالیسی کرنی شروع کردیتا ہے؛ حالاں کہ کوئی طالبِ علم کند ذہن نہیں ہوتا؛ بلکہ بے فکری اور غلط صحبت کی وجہ سے اس کی ذہانت برباد ہوتی ہے۔

علم کی کمی کے وہ سرمایہ دار بھی ذمہ دار ہیں جو اپنی دولت کو تعلیمی ادارے بنانے اور اُن کو سنبھالنے میں خرچ کرنے کے بجائے ﴿هَـلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ○﴾ کی خواہش میں اس دولت کو شادی محل بنانے میں خرچ کردیتے ہیں اور وہ اصحابِ خیر بھی ذمہ داری ہیں جو اپنی اولاد کی شادی میں ایک ایک رات میں کروڑوں روپیہ نالیوں میں پانی بہانے کی طرح بہادیتے ہیں، نہ اُن کے نزدیک علم کی قدر ومنزلت ہے نہ غریبوں کی دلشکنی کا احساس اور نہ ہی احکامِ شریعت کا پاس ولحاظ، غیروں کی شادی اور ان کے محلوں کا جائزہ لے لیں کہ کس قدر سادی شادی اُن کے اولاد کی ہوتی ہے اور اُن کے محلوں میں شادی محل کم اسکول کالج اور انسٹیٹیوٹ زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے، اور مسلمانوں کے علاقوں کی ایک سیر کرلیں، ایک ایک محلّہ میں دو سے زائد فنکشن ہال کا نظارہ ہوجائے گا اور ہر رسمِ بد کے لیے الگ الگ سہولتیں فراہم ہوں گی، آج کل عقیقہ، ختنہ، یومِ پیدائش، سگائی، ہلدی، شکرانہ کی دعوتیں بھی شادی محل میں ہونے لگی ہیں، امت کا بڑا طبقہ علمِ دین سے جو محروم ہے وہ انھیں کی نحوست ہے۔ **الأمان والحفیظ وإلی اللّٰہ المشتکٰی**

(جاری...)

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ (قسط۱۰)

قلب کو اخلاقِ محمودہ سے مزین کرنے کا بیان

ازقلم: مفتی محمد سلطان خان قاسمی، امام وخطیب مسجد ابوبکر صدیق، ڈی جے ہلی، بنگلور

پچھلی قسط میں فقر کی فضیلت کو بیان کیا گیا؛ نیز حضراتِ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کس طرح دنیا کی وسعتوں سے گھبراتے اور خوف کھاتے تھے، اِس کو واضح کیا گیا۔

اب مندرجہ ذیل قسط میں: صبر کی فضیلت اور اس کے درجات کو بیان کیا گیا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے صبر کرنے والوں کے لیے اتنی صفات جمع فرمائی ہیں، جو دوسروں کے لیے جمع نہیں فرمائیں۔

چناں چہ ارشادِ باری عزاسمہٗ ہے: ﴿وَاصْبِرُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ○﴾ (صبر کیا کرو، اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)۔

﴿اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ○﴾ (ایسے ہی لوگوں پر عنایتیں ہیں اپنے رب کی اور مہربانی اور وہی ہیں سیدھی راہ پر)۔

(سورۂ بقرہ، آیت: ۱۵۷، پارہ: ۲، رکوع: ۳، ترجمہ از شیخ الہندؒ)

﴿وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○﴾ (سورۂ نحل، آیت: ۹۷) (اور بدلے میں دیں گے اُن کو حق اُن کا بہتر کاموں پر جو کرتے تھے)۔ (ترجمہ از شیخ الہندؒ)

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَا صَبَرُوْا﴾ (سورۂ سجدہ: ۲۴) اور کیے ہم نے اُن میں پیشوا جو راہ چلاتے تھے ہمارے حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے)۔ (ترجمہ از شیخ الہندؒ)

دوسری جگہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○﴾ (سورۂ زمر: ۱۰) (صبر کرنے والوں ہی کو ملتا ہے اُن کا ثواب بے شمار)۔ (ترجمہ از شیخ الہندؒ)

اِن آیاتِ کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے صبر کرنے والوں کی بہت ساری خوبیوں کو بیان کیا ہے، جن خوبیوں کی بناء پر صابرین کو آخرت میں بہترین بدلہ عطا کیا جائے گا۔

کلامِ مجید میں کچھ اُوپر ستر (۷۰) جگہ صبر کا ذکر آیا ہے۔ (تبلیغ دین، ترجمہ از الاربعین فی اصول الدین: ۳۷۲)

رسولِ مقصود صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: صبر نصف ایمان ہے۔ (رواه أبو نعيم في الحليه: ٣٤٠٥،

والخطيب في تاريخ بغداد: ۲۲۷/۱۳) من حديث سيّدنا عبد الله بن مسعود رضي الله عنه.
(بحوالہ الاربعین فی اصول الدین:۳۷۲)

دوسری روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نعمتوں میں کم از کم اگر تم کو ایمان کی صبر کی دولت نصیب ہوجائے تو سمجھو جس کو یہ دونعمتیں حاصل ہوجائیں تو وہ بڑی سعادت حاصل کرنے والا ہے۔

اور شب بیدار وصائم الدہر سے افضل اس کا درجہ ہے۔(**ذكرها أبو طاهر المكي في قوت القلوب: ۱۹٤/۱)من حديث سيّدنا أبي أمامة الباهلي رضي الله عنه.** (بحوالہ:الاربعین فی اصول الدین:۳۷۳)

دوسری روایت: حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: صبر جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔(**رواه الخركوشي في تهذيب الأسرار: ۱۹۳، وأبو نعيم في الحلية: ۱۱۷/۷)من حديث سيّدنا أنس رضي الله عنه.** (بحوالہ الاربعین فی اصول الدین:۳۷۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صبر کے بارے میں سوال کیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایمان صبر کا نام ہے۔(ترجمہ از: مرتّب)

صبر کے معنیٰ اور انسان کے ساتھ اس کا اختصاص

حضرت امامِ غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے صبر کی فضیلت کو بیان کرنے کے بعد صبر کے حقیقی معنیٰ اور انسان کے ساتھ اس کا خاص ہونا بیان کیا ہے۔

صبر کے حقیقی معنیٰ ہوائے نفس کے مقابلہ میں خدا کے حکم پر مستقل اور ثابت قدم رہنے کے ہیں کہ یہ صرف انسان ہی کو حاصل ہوسکتا ہے؛ اِس لیے کہ اس پر دو مخالف لشکر مسلط اور حملہ آور ہیں، جن میں: (۱) ایک خدائی لشکر یعنی فرشتوں اور عقل شریعت کا لشکر ہے، جن کا مقصود یہ ہے کہ انسان کو اپنے قابو میں لائیں اور ہدایت پر قائم رکھیں؛ کیوں کہ فرشتے صبح وشام اللہ کی تسبیح وتحمید میں مصروف ہوتے ہیں اور وہ وہی کرتے ہیں جن کا حکم ہوتا ہے ﴿**لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ○**﴾ (سورۂ مریم:۸)

اور (۲) دوسرا شیطانی لشکر یعنی غیظ وغضب اور نفس کی خواہشوں اور اس کے اسباب کا لشکر ہے جو چاہتا ہے کہ انسان کو اپنے قبضہ میں رکھے اور پابندِ ہوا وحرص بنائے، انسان کو بالغ ہوکر دونوں میں امتیاز کرنا اور شیطانی گروہ سے جنگ وجدل کرنا پڑتا ہے۔ (تبلیغ دین:۱۸۴، ترجمہ الاربعین فی اصول الدین:۳۷۴)

اگر عقلِ سلیم اور عقلِ شریعت کو غلبہ حاصل ہوا اور انسان فرشتوں کی صفت سے متصف ہوجائے تو انسان فرشتوں کے مقام کو حاصل کرلیتا ہے اور اگر انسان پر شیطانی لشکر غالب آجائے اور انسان شہوتوں وہوائے نفس کا مرتکب ہوجائے تو انسان جانور بن جاتا ہے؛ بلکہ گناہوں پر اصرار اور شہوتوں کا عادی ہونے کی وجہ سے جانور سے بھی بدتر ہوجاتا ہے، جیسا کہ قرآنِ مجید میں مذکور ہے: ﴿اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ﴾ (سورۂ اعراف:۱۷۹)

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کی صفت انسان کے ساتھ خاص ہے؛ کیوں کہ فرشتے تو ایک حالت پر پیدا کیے گئے ہیں ﴿لَایَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآاَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَایُؤْمَرُوْنَ ○﴾ اور جہاں تک بہائم اور جانوروں کی بات ہے وہ غیر مکلّف ہیں اور ناسمجھ ہیں کہ اللہ پاک نے ان کو عقلِ سلیم سے محروم رکھا ہے؛ لہٰذا صبر کو اپنانا انسان ہی کے ذمے ہے، **لالغیرہ**۔ (اضافہ از: مرتّب)

خاص طور پر جب انسان بالغ ہوتا ہے تو خدائی لشکر اور شیطانی لشکر دونوں اُس پر حاوی ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور انسان خدائی لشکر کو اپنا کر اللہ کا فرماں بردار بن جاتا ہے اور شیطانی لشکر پر غلبہ حاصل کرلیتا ہے، تو اُس کو صبر کا مقام حاصل ہوتا ہے۔

کیوں کہ انسان کی صرف دو ہی حالتیں ہیں: (۱) اللہ کی اطاعت وفرماں برداری (۲) اللہ کی معصیت ونافرمانی، اللہ کا مطیع اور فرماں بردار بننے کے لیے اللہ کی نافرمانی سے بچنا ضروری ہے، یعنی صبر کو اختیار کرنا اور ہوائے نفس سے اپنے کو بچانا پڑتا ہے اور اسی کا نام صبر ہے۔

اِس کی مثال ایسی ہے جیسے مریض کو تلخ دوا دی جاتی ہے تو طالب لذت، ذائقہ اور مزہ تو چاہتا ہے کہ اس کے پاس نہ آنے دے اور عقل چاہتی ہے کہ اگر چہ اس کی تلخی ناگوار گزرے گی؛ مگر آنکھیں بند کرکے جبراً وقہراً پی لی جائے؛ تاکہ شفاء جلد حاصل ہوجائے، پس اگر عقل کو غلبہ ہوگا تو بے شک دواء کی تلخی پر صبر کیا جائے گا، اِس طرح اگر دینی معاملہ میں عقل اور فطرتِ سلیمہ کو غلبہ ہوگا تو ضرور ہے کہ ریاضت اور مجاہدہ کی دشواریوں کو برداشت کیا جائے گا؛ چوں کہ ایمان نام ہے علم اور عمل کا اور عمل کی دو جانبیں ہیں، جن میں بعض کا کرنا مقصود ہے اور بعض سے باز رہنا، اِس طرح اخلاق وعادات میں عاداتِ محمودہ سے آراستہ ہونا ضروری ہے اور خصائل رذیلہ سے خالی اور پاک رہنا لازمی ہے اور یہ درجہ بغیر صبر کے حاصل نہیں ہوسکتا۔

(تبلیغ دین:۱۸۶، ترجمہ الاربعین فی اصول الدین:۳۷۴)

اسی لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''اَلصَّبْرُ نِصْفُ الْإِیْمَانِ'' کہ صبر ایمان کا آدھا حصہ ہے، یعنی اگر ایمان کے حصے بنائیں: (۱) حصہ اللہ کی اطاعت (۲) دوسرا حصہ اللہ کی معصیت، تو

آدھا حصہ تو صبر کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ اللہ کی نافرمانی سے بچنے کے لیے اپنے نفس کو خواہشات اور شہوات سے بچانا لازم ہے۔

اِسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''اَلصَّوْمُ نِصْفُ الصَّبْرِ''. (رواہ الترمذی:۳۵۱۹) عن رجل من بني سليم. (بحوالہ: الاربعین فی اصول الدین:۳۷۴)

کہ روزہ وہ آدھا صبر ہے، یعنی بغیر صبر کے روزہ پورا نہیں ہوسکتا؛ اِس لیے صبر ہی کے ذریعہ آدمی روزہ کی حالت میں شہوت پر غلبہ حاصل کرتا ہیاور اپنے آپ کو گناہوں سے بچاتا ہے؛ نیز صبر ہی کے ذریعہ آدمی روزہ کی حالت میں غیر مناسب اخلاق، لڑائی جھگڑا، گالی گلوج، غیبت وچغل خوری وغیرہ سے محفوظ رہتا ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ روزہ سے آدمی شہوتوں سے بچ جاتا ہے اور یہ صبر کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ (الاربعین فی اصول الدین:۳۷۴، ترجمہ وتوضیح از مرتّب)

صبر کا اعلیٰ درجہ

صبر کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ شہوت اور ہوائے نفس کے مادّہ ہی کا قلع قمع ہوجائے کہ اس کو مقابلہ کی قدرت ہی نہ رہے اور دین پر ثبات وبقا نصیب ہو اور اس پر دوام واستقامت صبر کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے آدمی بڑے مجاہدے اختیار کرلیتا ہے اور دین کی راہ میں اپنی قربانیاں پیش کرتا ہے، انھیں کی شان میں مذکور ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ (سورۂ حٰم سجدہ) اور انھیں نفوس کو نفسِ مطمئنہ کے خطاب سے مخاطب بنا کر مرتے وقت بشارت دی جائے گی کہ: اے نفسِ مطمئنہ چل اپنے پروردگار کی طرف، کہ تُو اللہ سے راضی اور اللہ تجھ سے راضی ﴿اِرْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○﴾ (سورۂ فجر)

صبر کا ادنیٰ درجہ اور اس کے آثار

سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ہوائے نفسانی غالب آجائے اور قلب شیطانی لشکر کے حوالہ ہوجائے، ایسی خطرناک حالت والوں کو حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں: ﴿وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَاَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ○﴾ (سورۂ حٰم سجدہ)

اِس کی دو علامتیں ہیں: (۱) ایک یہ کہ ''ایسا شخص کہا کرتا ہے کہ صبر کا شوق تو ہے؛ مگر مجھ سے ہو نہیں سکتا اور اس لیے اب اس کی کچھ خواہش بھی نہیں رہی''، یہ یاس اور نا اُمیدی کا درجہ ہے جو مہلک ہے اور جاں بَری کی اُمید نہیں۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ توبہ کا شوق بھی نہ رہے اور کہنے لگے اللہ رحیم وکریم ہے، اُسے میری توبہ کی کچھ

پرواہ نہیں ہے، اگر توبہ کے بغیر وہ مجھ کو جنت میں بھیج دے گا تو اِس سے جنت جیسی وسیع جگہ چھوٹی نہیں پڑ جائے گی اور خدا کی رحمتِ کاملہ میں کچھ کمی نہیں آجائے گی۔

یہ بے چارہ کم عقل و متحیر ہے، اس پابند ہوا و ہوس شخص کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مسلمان شخص کافروں کے ہاتھ میں قید ہو جائے اور کافر اُس کو کبھی خنزیروں کے چَرانے اور اُن کے کھلانے پلانے کی خدمت سپرد کر دیں اور کبھی اس کی گردن اور کمر پر شراب کے پیپے لدوا کر اُسے گھروں تک لے جائیں اور یہ اس ذلیل حالت کو ذلیل نہ سمجھے، پھر بھلا اس کی نجات کی صورت ہو سکتی ہے؟

دوسری مثال: اگر بادشاہ کی کسی پیاری اولاد کو پکڑ کر کسی ذلیل و بے عزت غلام کے حوالے کر دیا جائے کہ وہ غلام اس شہزادے کو اپنا غلام بنالے کہ اس سے پاؤں دبوائے اور جو چاہے خدمت لیا کرے، تو اس بے چارے شہزادے کا کیا حال ہوگا؟ اسی طرح اس غفلت شعار مسلمان کا حال ہے۔ **نعوذ باللّٰہ من ھٰذا الحال الردي.**

(تبلیغ دین: ۱۸۵، ترجمہ از الاربعین فی اصول الدین: ۳۷۶)

صبر کا متوسط درجہ اور اس کی علامت

متوسط درجہ یہ ہے کہ خدائی لشکر اور شیطانی گروہ میں جنگ و جدال قائم رہے، کہ کبھی اس کا پلہ بھاری ہو جائے اور کبھی اس کا پلہ، نہ اس کو کامل شکست ہو اور نہ اس کو کھلی ہوئی فتح، پس اس قسم کے لوگوں کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿**خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا**﴾ (یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اعمالِ صالح کو بدکاریوں میں خلط کر رکھا ہے، اُمید ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ ان پر توجہ فرمائے)۔

اِس کی علامت یہ ہے کہ ضعیف خواہشوں کو چھوڑ دے اور زور آور شہوات کو نہ چھوڑ سکے اور کبھی خواہشات کو چھوڑ دے اور کبھی ان کے ہاتھوں عاجز آجائے؛ مگر اپنے مغلوب ہونے پر حسرت و افسوس ضرور کرتا اور برابر اس کوشش میں لگا رہے کہ کسی طرح نفس پر قابو حاصل ہو جائے تو بہتر ہے، اس کو جہادِ اکبر کہا گیا ہے۔

اور اس میں اس کو دیکھنا چاہیے کہ کہاں تک فتح حاصل کر سکتا ہے، اگر مغلوب رہا اور قوتِ عقل کو غلبہ نہ دے سکا تو بالکل جانور کے برابر ہے؛ بلکہ اس سے بھی گیا گزرا ہوا؛ کیوں کہ ان میں عقل نہیں ہے۔ اور انسان میں چوں کہ عقل ہے، اس کے باوجود چوپایہ کی طرح اپنی خواہشِ نفس کے پورا کرنے میں مصروف ہے اور اگر غالب آگیا تو کام بن گیا۔

(تبلیغ دین: ۱۸۷، ترجمہ از الاربعین فی اصول الدین: ۳۷۷، ترجمہ: از مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ)

اصلاحِ معاشرہ

تصورِ جمہوریت

ازقلم: مولوی محمد عمر فاروق فتح پوری، متعلّم ندوۃ العلماء لکھنؤ

اِس وقت کرۂ ارضی پر انسانی مسائل کے حل وعقد کے لیے مختلف نظامہائے سیاست رائج ہیں؛ لیکن اِن تمام نظامہائے سیاست میں سب سے زیادہ مقبول ومعتمد جس نظام کو تسلیم کیا گیا ہے وہ جمہویت یا سیکولر نظام ہے، درج ذیل سطور اِسی نظامِ جمہوریت سے متعلق مباحث پر مبنی ہیں، بایں غرض کہ قارئین نے جمہوریت سے متعلق اپنے اذہان میں جو تصور قائم کر رکھا ہے وہ ان مباحث میں جمہوریت سے متعلق اپنے قائم کردہ تصور کی حقیقت تلاش کر کے ایک معتدل اور درست نظریہ کی تعمیر کر سکیں۔

جمہوریت کی لغوی تشریح:

لفظِ جمہوریت درحقیقت یونانی لفظ ڈیموکریسی (Democracy) کا متبادل اُردو لفظ ہے Democracy دو اجزا سے مرکب ہے، Demos اور Kratois۔

Demos کے معنیٰ پیپل (People) یعنی عوام کے ہیں، Kratois کے معنیٰ رول (Rule) یعنی حاکمیت کے ہیں۔

چناں چہ Democracy کے معنیٰ ہوئے Rule of the people یعنی عوام کی حاکمیت اور لغتِ عربی میں جمہوریت مادۂ "جَـمْهَـرَ" سے ماخوذ ہے اور "جَـمْهَـرَ" کے بنیادی معنیٰ ہیں: کسی چیز کا جمع ہونا یا اکثریت میں ہونا؛ چناں چہ جمہور کے معنیٰ علمائے لغت نے بیان کیے ہیں: "**الجمهور من الناس أي جلهم وجمهور القوم أي أشرافهم**" یعنی عوام الناس اور ان کے معززین کی اکثریت؛ لیکن عربی زبان میں Democracy کا متبادل لفظ "دیموقراطیۃ" ہے۔

جمہوریت کی اصطلاحی تعریف:

ویسے تو جمہوریت کی جامع ومانع اصطلاحی تعریف میں علماء وماہرین کے درمیان شدید اختلاف ہے؛ لیکن چند معتدل تعریفات یہاں پر ذکر کی جاتی ہیں؛ چناں چہ یونانی مفکر ہیروڈوٹس (Herodotus) نے

جمہوریت کی تعریف یوں کی ہے: ''جمہوریت ایک ایسی حکومت ہوتی ہے جس میں ریاست کے حاکمانہ اختیارات قانونی طور پر پورے معاشرہ کو حاصل ہوتے ہیں''۔

سابق امریکی صدر ابراہام لنکن (Abraham Lincoln) کا یہ قول جمہوریت کا نعرہ ہے:

"Government of the people by the people for the people"

(عوام کی حکومت عوام کی مرضی سے عوام پر)

اکسفورڈ ڈکشنری میں Democracy کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"A system of government in which the people of acountry can vottelect thais representati".

''ایسا نظامِ حکومت جس میں ملک کے عوام اپنے نمائندوں کو منتخب کرنے کے لیے ووٹ دے سکتے ہیں''

اور ڈاکٹر حسن صعب نے عربی میں دیموقراطیہ یعنی Demersiary کا مطلب اِس طرح ادا کیا ہے:

''**وإذا كان الحكم لأكثرية الشعب كان المنتظم جمهوريا أو ديموقرطيا**''.

الغرض! مذکورہ بالا تمام تعریفات کا بحیثیت مجموعی مفہوم یہی ہے کہ جمہوریت سے مراد ایسا نظامِ حکومت ہے جس میں عوام کی رائے کو کسی نہ کسی شکل میں حکومت کی پالیسیاں طے کرنے میں بنیاد بنایا گیا ہو۔

تاریخِ جمہوریت:

ایک بڑی اکثریت کے ذہن میں یہ مغالطہ ہے کہ جمہوریت ۲۰۰ رسال قبل انقلابِ فرانس کے نتیجہ میں وجود پذیر ہوئی ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کی ایک نئی قسم Liberal Democracy انقلابِ فرانس کے نتیجہ میں وجود میں آئی تھی اور موجودہ دَور میں تمام جمہوری ممالک میں اسی نوعیت کا نظام جمہوریت نافذ ہے، جو یورپ کی نشأۃِ ثانیہ کے بعد دراصل پوری دنیا پر تسلط قائم کرنے کا یورپ کا سب سے بڑا حربہ ہے اور جس میں وہ کامیاب بھی نظر آتا ہے۔ جہاں کی مطلق جمہوریت کا تعلق ہے اُس میں بھی مؤرخین ومحققین کی کئی آراء ہیں؛ لیکن قوی رائے یہ ہے کہ سب سے پہلے یونان میں جمہوریت کا تصور ملتا ہے اور یونانی فلسفیوں: افلاطون اور ارسطو وغیرہ کی نظامِ جمہوریت وسیاست پر باقاعدہ تصانیف بھی ملتی ہیں۔ یونان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں یہ نظام نافذ العمل ہوتا تھا، جس کی شکل یہ تھی کہ بادشاہ اپنے مشورے کے لیے کوئی کونسل یا مجلسِ شوریٰ بنالیتا تھا اور وہ مجلسِ شوریٰ سے مشورے طلب کیا کرتا تھا اور محققین کی یہ رائے بھی قابلِ توجہ ہے کہ جمہوریت کا سب سے پہلے سراغ ہندوستان میں ملتا ہے، ۶۰۰ رقبل مسیحی میں ہندوستان میں جمہوری ریاستیں موجود تھیں اور ان کو Janapdas (جانا پداس) کہا جاتا تھا۔

جمہوریت کے اجزائے ترکیبی:

نظامِ جمہوریت کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ نظام کن اجزاء وعناصر سے تشکیل پاتا ہے۔

(۱) ریاست (State):

جدید جمہوری فکر میں ریاست کو انسان کا تخلیق کردہ ایک ادارہ گردانا گیا ہے جو Liberal Democracy کے تحت قومیت اور طبقاتی کشمکش (Class wer) کے باہمی تعامل سے وجود میں آیا ہے، انسان نے نظریۂ ریاست اپنے مقصد کے حصول کے لیے ترتیب دیا ہے؛ اِسی لیے اِس پر حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ (Sovereignty) کا اختیار بھی اسی کو حاصل ہے اور یہی تصویر آج مشرق ومغرب میں پوری آب وتاب کے ساتھ رائج ہے۔

(۲) حکم/ امر:

اِس کے تحت تین شعبے ہیں:

(۱) مقننہ (قانون ساز ادارہ) Parlment

(۲) عدلیہ (انصاف کرنے والا ادارہ) Judiciary

(۳) انتظامیہ Administration

بعض حضرات نے ذرائع اَبلاغ (Media) کو بھی اسی کے تحت شمار کیا ہے۔

(۳) حکومت ومذہب کی علیٰحدگی:

نظامِ جمہوریت کا ایک عنصر یہ ہے کہ نظامِ حکومت سے مذہب کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

(۴) سیاسی مساوات:

ایک اہم جز یہ بھی ہے کہ اِس میں عام شہری کے سیاسی حقوق مساوی ہوتے ہیں، جیسے: مرد/عورت اور مسلم/ غیر مسلم کے سیاسی حقوق یکساں قرار پاتے ہیں۔

(۵) آزاد انتخابات:

یہ بھی نظامِ جمہوریت کا ایک بنیادی جز ہے، جس میں تمام معاشرتی اخلاقیات کا جنازہ نکال دیا جاتا ہے، اپنی جماعت کے اُمیدار کو فرشتہ اور مدمقابل کو شیطان قرار دیا جاتا ہے۔

(۶) اکثریت کی اطاعت:

یہ نظامِ جمہوریت کا ایک بنیادی عنصر اکثریت کی اطاعت ہے، جس پر اس کے نظام کی پوری امارت کھڑی ہے۔

(۷) تصورِ نمائندگی:

نظامِ جمہوریت کے عناصرِ اَساسیہ میں ایک یہ بھی ہیں کہ صائب الرائے لوگوں کو اہمیت دینے کے بجائے محض اپنے لوگوں کے حق میں فیصلہ دیتا ہے خواہ وہ کسی بھی کردار اور شخصیت کا حامل ہو۔

کیا حقیقی جمہوریت ممکن ہے؟

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت (عوام کی حکومت) اور اکثریت کے اُصول کو عملی جامہ پہنانا بہت حد تک ناممکن ہے؛ اِسی لیے نوبرٹو بابیو Noberto Bobio کا یہ کہنا درست ہے کہ حقیقی جمہوریت کبھی معرضِ وجود میں نہیں آئی اور نہ ہی کبھی مستقبل میں آئے گی؛ کیوں کہ جمہوریت کا فلسفہ Rule of people ایک طرف تو فکری ونظری اعتبار سے کئی حوالوں سے نامکمل ہے اور محلِ نظر ہے اور دسری طرف تجربات نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس تصویر کے عملی صورت میں ڈھلنے تک اس میں کئی انحرافات (Deviations) واقع ہو چکے ہوتے ہیں، اِس کی وجہ یہ ہے کہ ہر دو لفظ Rule اور People کے مفاہیم کی تعیین میں اُلجھاؤ اور پیچیدگی در آتی ہے، یعنی یہ کہ لفظ Rule کے تحت اقتدار اور حاکمیت کی نوعیت کے حدود آداب کیا ہوں اور لفظ People کے تحت؛ عوام سے مراد کون؟

جمہوریت اور اسلام:

جمہوریت کے جو عناصرِ ترکیبیہ درج بالا میں ذکر کیے گئے ہیں اُن سے متعلق مشہور عالم مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رقم طراز ہیں کہ ان جملہ عناصر میں پانچ عناصر ایسے ہیں جو شرعاً ناجائز ہیں:

(۱) حق بالغ رائے دہی بشمول خواتین (سیاسی وجنسی مساوات)۔
(۲) ہر ایک کے ووٹ کی یکساں قیمت۔
(۳) درخواست برائے نمائندگی اور اس کے جملہ لوازمات۔
(۴) سیاسی پارٹیوں کا وجود۔
(۵) کثرتِ رائے سے فیصلہ۔

درحقیقت واقعہ یہ ہے کہ ان عناصرِ خمسہ میں سے ایک عنصر بھی اگر حذف کر دیا جائے تو جمہوریت کی گاڑی ایک قدم بھی آگے نہ بڑھے گی، جب کہ اسلامی نظامِ حکومت ان میں سے ایک کو بھی تسلیم نہیں کرتا ہے، اس کے برعکس اسلامی نظام کی بنیاد خدا کی حاکمیت کے عقیدہ پر اُٹھتی ہے، قرآنِ کریم نے جس کو مختلف مواقع پر جدا جدا پیرایۂ بیان کے ساتھ دوٹوک انداز میں بیان کیا ہے: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (حاکمیت اللہ کے سوا کسی کی نہیں)، ﴿اَلَا لَهُ الْحُكْمُ﴾ (یاد رکھو حاکمیت صرف اُسی کو حاصل ہے)۔

غرض اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اقرار ہی وہ بنیاد ہے جو اسلامی نظامِ حکومت وسیاست کو جمہوریت اور سیکولر نظام سے الگ کر دیتا ہے۔ اور دوسرا تصور یہ کہ مسلمان حکمران اور سیاست میں شامل کارپردازان خود کو اللہ تبارک وتعالیٰ کا نائب اور اس کے نتیجے میں خود کو اس کے حضور جواب دہ سمجھیں، خدا کی بندگی کے احساس کے ساتھ خدا کے بندوں کے تئیں تمام ریاستی معاملات سرانجام دیں۔ عہدوں ومناصب کی تقسیم میں اہمیت وقابلیت اور تقویٰ کو معیار بنائیں، خدا کی نیابت کے پیشِ نظر خدا کی صفتِ عدل وانصاف سے آراستہ ہوں۔

دَورِ حاضر کی جمہوریت سے متعلق ایک چشم کشا رپورٹ:

دنیا بھر میں جمہوری صورتِ حال کے مطابق وی ڈیم (ورائیٹر آف ڈیموکریسی) انسٹی ٹیوٹ کی ایک حالیہ رپوٹ میں کہا گیا ہے کہ گزشتہ ایک دہائی کے دَوران ایشیاپیسیفک خطہ میں افغانستان، بنگلہ دیش، کمبوڈیا، ہانک کانگ، تھائی لینڈ اور فلپائن کے ساتھ ساتھ ہندوستان تاناشاہی کے معاملہ میں سرفہرست ممالک میں ہے، رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ تکثیریت کی مخالفت جماعتوں اور ان کے رہنماؤں میں جمہوریت عمل کا فقدان ہے، وہ اقلیتوں کے بنیادی حقوق کو نظرانداز کرتے ہیں، سیاسی مخالفین کو دبانے کی حوصلہ افزائی اور سیاسی تشدد کی درپردہ حمایت کرتے ہیں۔ قوم پرستی، رجعت پسندی اور آمیریت کے ایجنڈہ کو آگے بڑھانے کے لیے اقتدار کا استعمال ان کا شیوہ ہوجاتا ہے۔ ہندوستان میں اِس صورتِ حال کو برسرِ اقتدار پارٹی سے جوڑا گیا ہے، گزشتہ دو برس کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ ۲۰۱۴ء سے ہندوستان میں جمہوریت کی سطح میں بہت زیادہ گراوٹ آئی ہے، ۲۰۱۳ء کے بالمقابل ۲۰۲۰ء میں 0.23 گراوٹ دیکھی گئی ہے، ۲۰۱۳ء میں جمہوریت کی سطح عروج 0.57 پر تھی جو کہ گھٹتے گھٹتے 0.35 رہ گئی ہے۔ یاد رہے کہ جمہوریت کی سب سے نچلی سطح صفر اور اعلیٰ سطح ایک مانی جاتی ہے۔ واللہ اعلم

جمہوریت سے متعلق مزید تفصیل جاننے کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ادیان کی جنگ دینِ اسلام یا دینِ جمہوریت (مولانا عاصم عمر)

(۲) مغربی جمہوریت اور سراب (ڈاکٹر سعید احمد علوی)

(۳) حقیقتِ جمہوریت (ابو معاذ)

(۴) اسلام اور جمہوریت (اسحاق باجوڑی)

(۵) خلافت اور جمہوریت (مولانا عبدالرحمٰن کیلانی)

اصلاحِ معاشرہ

شاگردوں پر شفقت ونرمی کے بے مثال نمونے

ازقلم: مفتی احمد اللہ نثار صاحب قاسمی، ناظم دارالعلوم رشیدیہ وصدر دارالافتاء والارشاد حیدرآباد

صاحبزادگی کو عام طلبہ پر فوقیت نہ دینا:

برہان الائمہ ''ذخیرۃ الفتاویٰ'' اور ''المحیط البرہانی'' کے مصنّف محمود بن احمد مرغینانیؒ سب طلبہ سے فارغ ہونے کے بعد دوپہر کے وقت اپنے دونوں بیٹوں ''صدرالسعید تاج الدین احمد اور صدرالشہید حسام الدین عمر'' کا سبق سب طلبہ سے پیچھے دوپہر کے وقت مقرر کیا تھا، لڑکوں نے کہا: اس وقت پڑھنے میں طبیعت نہیں لگتی، فرمایا: جو طلبہ دُور دُور سے میرے پاس آتے ہیں، میرے لیے ضروری ہے کہ پہلے اُنہیں پڑھاؤں، ان لڑکوں نے اس میں مزاحمت نہ کی، اس کی برکت سے اپنے زمانہ کے بڑے عالم ہوئے اور اپنے ہمعصروں پر فوقیت لے گئے۔ آج کل صاحبزادگی کے مرض کے شکار ہوکر اکثر اساتذہ کے لڑکے جاہل رہ جاتے ہیں، یا دوسری لائن اختیار کر لیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم اس گھر سے ختم ہوجاتا ہے، دوسرے طلبہ کے مقابلہ میں کبھی اپنی اولاد کو ترجیح نہ دینا چاہیے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ: ''اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسے خلوص اور محبت سے پیش آؤ کہ دوسرا دیکھے تو سمجھے کہ یہ تمہاری اولاد ہیں''۔

صاحبزادوں کے حق میں دعا سے بڑا کوئی عمل کارگر نہیں:

☆ حضرت علی خواص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''علماء ومشائخ کے لیے اپنی اولاد کے حق میں بارگاہِ خداوندی میں دعا سے بڑھ کر کوئی انتظام نفع بخش نہیں؛ کیوں کہ اولاد کی تربیت والد کے ناز اور والدہ کی محبت میں ہوتی ہے؛ نیز لوگوں کا عالم باپ کی وجہ سے اُس کی عظیم کرنا ہی اُسے بگاڑنے کے لیے کافی ہے؛ اِس لیے عموماً ان کو فضائل وکمالات حاصل کرنے کی طرف رغبت نہیں ہوتی؛ بلکہ یہ زعم ہوتا ہے کہ جس جاہ وعزت کی خاطر مجھے تحصیلِ علم اور ریاضت ومجاہدہ کی ضرورت تھی وہ تو مجھے والد کی وجہ سے حاصل ہی ہے، پھر مجھے اس کے حاصل کرنے میں محنت ومشقت کرنا لغو وبیکار ہے، جب کہ عوام الناس کی اولاد خصوصاً کسانوں کی اولاد

کہ ہوش سنبھالتے ہی سختی وتشدد شروع ہوجاتا ہے، اذیت وکلفت سے نکلنے کی فکر اُنھیں تحصیلِ علم وکمال کی طرف راغب کرتی ہے، جس قدر اُن کی عزت کی جائے اُسی قدر ترقی کرتے ہیں، یہاں تک کہ ''شیخ الاسلام''، ''مفکر اسلام'' اور ''شیخ الطریق'' بن جاتے ہیں''۔ (اخلاقِ سلف:۱۳)

شیخ الہندؒ کا اپنے شیخ اور استاذ کے بیٹے سے معافی مانگنا:

☆حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ''حافظ محمد احمد صاحبؒ'' اور حضرت گنگوہیؒ کے فرزند ''حکیم مسعود احمدؒ'' شیخ الہندؒ کے شاگرد ومرید تھے، ایک مرتبہ دونوں کو اپنی چارپائی پر بیٹھا کر خود زمین پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا: ''محمد احمد! آپ میرے استاذ کے صاحبزادے ہیں، مسعود احمد! آپ میرے مربی کے بیٹے ہیں، میں نے آپ کا حق ادا نہیں کیا، آپ سے معذرت چاہتا ہوں، اگر آخرت میں آپ کے والدین پوچھیں کہ محمود نے کیا کیا؟ تو خدا کے لیے میرا خیال رکھنا اور مجھے رُسوا نہ کرنا''، خوفِ خدا ومعرفت حاصل تھی، تبھی اپنی حیثیت اپنی نظر میں کچھ نہ تھی، آج انہیں اکابر کے نام پر زبان کی جادوگری تو رہ گئی؛ مگر اندرون معرفت سے حالی ہوگئے۔

(مجالسِ علم وذکر:۱۱۳/۲)

☆معلّم ومدرس کی ذمہ داری بہت نازک ہے اور درجہ بھی بہت بلند ہے، ہمیشہ یہی فکر رہنی چاہیے کہ میں اپنی ذمہ داری کما حقہٗ اَدا نہیں کرسکا، جو معیار معلّم میں مطلوب ہے میں اُس کو حاصل نہ کرسکا۔

مسیح الامتؒ کا فرزند کی وجہ سے شاگرد سے معافی مانگنا:

☆ایک مرتبہ مسیح الامتؒ کے فرزند ''بھائی جان'' کی زمانۂ طالبِ علمی میں دوسرے طالبِ علم مفتی رشید احمد مرتّب ''حیاتِ مسیح الامت'' سے جھگڑا ہوگیا، دوپہر کے وقت گرمی کے موسم میں طلبہ مسجد کے اندر لیٹے ہوئے تھے، کسی نے دروازہ کی کنڈی بجائی، دروازہ کھولا تو دیکھا مسیح الامتؒ تشریف فرما ہیں، فرمانے لگے: مجھے معلوم ہوا کہ بھائی جان نے تم سے جھگڑا کیا ہے، میں اس کی تم سے معافی مانگنے کے لیے آیا ہوں، طالبِ علم نے کہا: حضرت! ایسی کوئی بڑی لڑائی نہیں تھی؛ مگر آپ رحمۃ اللہ علیہ بار بار معاف کرنے کے لیے فرماتے رہے۔

(اساتذہ کے لیے تربیتی واقعات:۲۱۶)

امامِ ربانی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل:

☆[امامِ ربانیؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ: ایک طالبِ علم فرش پر بیٹھا قرآنِ مجید پڑھ رہا تھا، حضرت نے خیال کیا تو اپنے نیچے فرش زیادہ پایا، فی الورز ائد فرش اپنے نیچے سے نکال کر اُس طالبِ علم کے نیچے بچھا دیا۔]

شیخ الہندؒ کا طالبِ علم کی دلداری:

مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے خسر مولانا محمود صاحب رامپور ضلع سہارنپور کے رئیس گھرانے کے فرد تھے، یہ خاندان حضرت گنگوہی اور بزرگانِ دین رحمہم اللہ سے وابستہ تھا، جب مولانا محمود صاحب کو تحصیلِ علم کے لیے دیوبند بھیجا گیا تو ان کا قیام حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کی مسجد کے ایک حجرے میں ہوا، دارالعلوم سے حضرت شیخ الہندؒ کے مکان کو جانے والے راستے پر دارالعلوم کے قریب ہی یہ مسجد واقع ہے، حسبِ عادت حضرت شیخ الہند دارالعلوم سے سبق پڑھا کر اپنے مکان کو تشریف لے جارہے تھے کہ اس مسجد کے دروازے پر مولانا محمود رامپوری کو کھڑا دیکھا، حال پوچھا تو معلوم ہوا کہ اسی مسجد کے ایک حجرے میں قیام ہے، حجرہ کے اندر جا کر دیکھا تو زمین پر بستر بچھا ہوا تھا، خیال آیا کہ رئیس زادہ ہیں، فرش پر سونے کی عادت نہ ہوگی، ان سے کچھ نہیں کہا اور اپنے گھر سے ایک چارپائی خود اُٹھا، راستہ، گلی، کوچہ اور بازار طے کرتے ہوئے اس مسجد کے قریب پہونچے، تو دیکھا کہ مولانا محمود صاحب مذکور، دروازہ سے نکل رہے ہیں، اب یہ خیال دامن گیر ہوا کہ مجھے بوجھ لاتے ہوئے دیکھ کر انہیں سخت شرمندگی ہوگی، تو اپنے بزرگانہ فعل کو یہ کہہ کر مٹایا کہ ''لومیاں محمود! اپنی چارپائی اُٹھاؤ، میں بھی شیخ زادہ ہوں، کسی کا نوکر نہیں ہوں''۔ یہ کہتے ہوئے واپس تشریف لے گئے۔

(البلاغ مفتیٔ اعظم نمبر: ج۱/ص۲۳۳)

مولانا مملوک علی صاحبؒ کا عمل:

☆ استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ کا حال یہ تھا کہ جب طالبِ علم بیمار ہوتا تو اُس کی قیام گاہ پر جا کر عیادت کرتے اور اُس کی ہر طرح دلجوئی کرتے؛ حالاں کہ اس زمانہ میں دارالطلبہ کا انتظام نہیں تھا، مختلف مساجد اور مکانوں میں طلبہ رہتے تھے۔

شاگرد کی خبر گیری شاگرد کا حق ہے:

☆ شاگرد کی خبر گیری، غیر حاضری پر بے چینی، بیماری میں عیادت، حاجت مندی پر معاونت محبت کی تخم ریزی کا فطری وقدرتی طریقہ ہے، علامہ ابوبکر رازی حنفیؒ جنھوں نے عباسی دَور کے خلفاء مطیع اللہ اور معز الدولہ کی طرف سے پیش کیے گئے منصبِ قضا کو بھی رَد کر دیا، آپ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق قاضی محمد بن محمد حسن حنبلیؒ فرماتے ہیں: میرے دادا حسن بن محمدؒ نے امام ابوبکر رازی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس فقہِ حنفی پڑھی، ایامِ طالبِ علمی میں تقریباً سو دن بیمار کی وجہ سے حاضرِ درس نہ ہو سکے، اس عرصہ میں ابوبکر رازی رحمۃ اللہ علیہ نے پچاس مرتبہ عیادت کی،

صحت یابی کے بعد درس گاہ میں فرمانے لگے: میاں تمہارے سودن کی بیماری میں پچاس دن کی عیادت کی؛ مگر پھر بھی تمہارے حق اعتبار سے بہت کم ہے۔ (معالمِ ارشادیہ:۲۵۸)

حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کا سبق آموز واقعہ:

☆مفسرِ قرآن حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے درسِ قرآن وتفسیر میں شرکت کے لیے چند طلبہ مولانا عبدالشکور صاحبؒ کی معیت میں ''کیمل پور'' پہنچے، اتفاقاً حضرت لاہوریؒ اسٹیشن پر موجود تھے، مولانا عبدالشکور صاحبؒ حضرت لاہوریؒ کے چہرے سے ناواقف تھے، عام آدمی خیال کر کے حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ ''ان طلبہ کو شیرانوالہ کی مسجد میں پہنچادیں، یہ حضرت لاہوری سے ملاقات کے لیے آئے ہیں''، حضرت لاہوریؒ نے بے تکلف طلبہ کا سامان اُٹھا کر مسجد پہنچادیا، بعد میں جب درس شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ ہمارا سامان پہنچانے والا وہی عظیم مفسر ہے، جن سے استفادہ کے لیے ہم نے سفر کیا۔

(امام الاولیاء نمبر:۳۵۹)

حضرت مولانا عبدالرحیم صاحبؒ کا واقعہ:

☆حضرت مولانا عبدالرحیم صاحبؒ صاحبِ ''نحوِ قاسمی'' دارالعلوم میں ''اصول الشاشی'' پڑھاتے تھے، ایک دن مفتی سلمان صاحب منصور پوری دامت برکاتہم کسی عذر سے حاضرِ درس نہ ہوسکے، تو بڑے پیار سے فرمایا: ''میاں سلمان! آج تم سب میں نہ تھے، تو درس میں زیادہ جی نہ لگا''، پھر آپ رحمۃ اللہ علیہ نے وہی سبق کمرے میں دوبارہ پڑھایا۔ یہ طالبِ علم سے شفقت کا ہی نتیجہ ہوتا ہے، کون طالبِ علم گرویدہ نہ ہوگا۔

طالبِ علم استاذ کے لیے صدقۂ جاریہ ہے:

☆لبِ ان حضرات کا یہ عمل طلبہ کے ساتھ اِس وجہ سے بھی تھا کہ طالبِ علم استاذ کے علم کو صدقۂ جاریہ بنانے کا ذریعہ ہے، استاذ کے علم کا فیض طالبِ علم کے ذریعہ امت میں منتقل ہوتا ہے، حتیٰ کہ آخرت میں رفع درجات کا ذریعہ بھی ہوتا ہے؛ اِس لیے علمائے سلف طالبِ علم کو اپنے اہلِ خانہ سے بھی زیادہ محبوب رکھا کرتے تھے، آج ہم تک جو علوم پہنچے ہیں وہ بہترین اساتذہ کے بہترین شاگردوں کے ذریعہ ہی پہنچے ہیں۔ علامہ ابنِ عبدالبرؒ فرماتے ہیں: امت کا خیر اسی میں مضمر ہے کہ اگلے والوں کا پچھلے والوں سے سیکھنے کا سلسلہ جاری رہے ''**لایزال الناس بخیر مابقی الأوّل حتی یتعلّم منه الآخر**''۔

طالبِ علم استاذ کے لیے شئ مطلوب ہے:

☆ علمائے ربانیین فرماتے ہیں: بدعمل و بے راہ شخص گم شدہ سامان کی طرح ہے، جو اللہ کی طرف بلانے والے کے لیے بیش بہا نعمت ہے، بے راہ طالبِ علم بھی استاذ کے لیے شئ مطلوب ہے، جس کا دل کی گہرائی، وسعتِ قلبی اور نرمی وشفقت کے استقبال کرنا چاہیے۔

طالبِ علم کی بداخلاقی حسنِ اخلاق سے درست کریں:

☆ جو استاذ اخلاقی بُرائیوں کو حسنِ اخلاق کے ذریعہ رفع کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا وہ استاذ کہلانے کا مستحق نہیں، اصل بات یہ ہے کہ عام طور سے اساتذہ کو اپنی بداخلاقیوں کی طرف بالکل توجہ نہیں ہوتی اور نہ اپنی اصلاح کی فکر ہوتی ہے، بزعمِ خود اپنے کو کامل سمجھ لیتے ہیں، اور ناقص جب اپنے کو کامل سمجھ لے تو اس سے جو بھی فتنہ اُٹھ کھڑا ہو وہ کم ہے۔

طالبِ علم کو شاگرد بن کر پڑھائیں:

☆ حضرت گنگوہیؒ نے ایک مرتبہ درس میں طلبہ سے پوچھا: میرے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ طلبہ نے جواب دیا: ہم میں سب سے افضل سمجھتے ہیں، آپ کی بات کو سچ سمجھتے ہیں، اگر قسم کھالیں تو جھوٹ کا شائبہ بھی نہیں ہوسکتا! آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''یاد رکھو! واللہ! میں تم میں سے ہر شخص کو اپنے سے ہزار درجہ افضل سمجھتا ہوں''، یہ سن کر طلبہ کی چیخیں نکل گئیں۔ (ملفوظات فقیہ الامت: ۳/۷۴)

صفاتِ کاملہ کے بغیر مقبول استاذ نہیں بن سکتے:

☆ شیخ عوامہ مدظلہٗ فرماتے ہیں: علمِ صحیح اور تصوفِ صحیح دونوں لازم وملزوم ہیں، جو صفات شیخِ کامل کی ہیں وہی صفات استاذِ کامل کی ہیں، جن میں بنیادی صفت یہ ہے کہ شیخِ کامل کی صحبتِ طویلہ سے اخلاقِ حسنہ، ریاضت، ومتابعتِ سنت سیکھا ہو اور استاذ سے ان صفات کا ظہور طلبہ کے ساتھ جذبۂ خیرخواہی اور علم وعمل کی مطابقت سے ہوتا ہے۔

مولانا سیّد امین الدین صاحبؒ کا سبق آموز واقعہ:

☆ احقر (قاری صدیق صاحبؒ) نے اپنے استاذ مولانا سیّد امین الدین صاحبؒ سے جو احقر کے رشتہ میں ماموں بھی ہوتے ہیں، فرماتے تھے کہ: حضرت مولانا سیّد ظہور الاسلام صاحبؒ، بانی ''مدرسہ اسلامیہ فتح پور''

کے زمانہ میں ایک بنگالی طالبِ علم سخت بیمار ہوا اور آخری حالت معلوم ہونے لگی؛ مولانا تشریف لے گئے، تو اُس طالبِ علم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، حضرت مولانا نے تسلی دی اور فرمایا: گھراؤ نہیں! تم ان شاء اللہ اچھے ہو جاؤ گے؛ اس کے بعد سجدہ میں دیر تک دعا مانگتے ہوئے فرمایا: اے اللہ! اگر جان ہی لینا طے ہے تو ظہور الاسلام کا بچہ ''عطیۃ اللہ'' حاضر ہے، یہ طالبِ علم پردیسی ہے، میری امانت میں ہے، اس کو صحت عطا فرما۔ حضرت الاستاذ نے فرمایا کہ: تھوڑی دیر میں گھر سے اطلاع آئی کہ ''عطیۃ اللہ'' کی حالت بگڑ رہی ہے، جلد تشریف لائے، حضرت مولانا پہنچے تو انتقال ہو چکا تھا، حضرت کا یہی اکلوتا اور ہونہار بیٹا تھا، اللہ پاک باپ بیٹے دونوں کی قبر کو نور سے بھر دے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خوں غلطیدن
حدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اسلاف کی شفقت کے یہ نمونے ہیں، آج ذرا سی اور معمولی سی بات پر طلبہ کی اِس قدر پٹائی ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ایک دشمن قبضہ میں آ گیا ہے، جس سے جی بھر کر انتقام لینا ہے۔

قاری صدیق صاحبؒ کا طلبہ کے ساتھ سلوک:

☆ ایک مرتبہ قاری صدیق صاحبؒ کے پاس ایک طالبِ علم کے غیر مسلم کا تیتر پکڑ لانے کی شکایت موصول ہوئی، حضرت نے غیر مسلم کی رعایت میں طالبِ علم کو سخت سزا دی، بعد میں طالبِ علم سے کہا: ''معاف کردو''، طالبِ علم نے کہا: ہرگز معاف نہ کروں گا اور بضد رہا، بالآخر حضرت نے ٹوپی سر سے اُتار کر اُس کے پیروں پر رکھ دی اور آبدیدہ ہو کر فرمایا: ''اِس کی تو لاج رکھ کر معاف کردو''، جب اُس نے معاف کیا، تو حضرت کو سکون ہوا۔

☆ ایک مرتبہ سفر میں ساتھ موجود طالبِ علم کو قے ہو گئی، سارے کپڑے خراب ہو گئے، دیگر احباب سے سبقت کرتے ہوئے خود ہی طالبِ علم کے کپڑے صاف فرمائے۔

☆ مدرسہ میں ایک طالبِ علم کے جسم کے زخم سے کمرے میں بدبو پھیل گئی، کوئی گزرنا گوارا نہ کرتا تھا، آپؒ اُس طالبِ علم کا بدن و بستر صاف فرما دیتے اور کبھی نابینا طالبِ علم کے بدن کا میل صاف کر دیتے۔

☆ جب مدرسے کے لیے لکڑیاں جنگل سے چُن کر لائی جاتی تھیں، اُس وقت ایک طالبِ علم کے پیر میں کھجور کا لمبا اور مضبوط کانٹا چبھ کر ٹوٹ گیا، بہت معمولی سا حصہ تھا، جو طلبہ کی پکڑ میں نہیں آ رہا تھا، حضرتؒ کو علم ہوا تو طالبِ علم کو لٹایا اور طالبِ علم کا پیر منھ کے قریب لے جا کر اپنے دانتوں سے کانٹا نکال دیا، سارے طلبہ بول پڑے: حضرت! آپ یہ نہ کریں، فرمایا: ''یہ حق مجھ کو ہی تھا؛ کیوں کہ یہاں میں ہی تمہارے لیے ماں باپ ہوں''۔

☆ایک طالبِ علم کافی بیمار ہوگیا، علاج کے لیے باندہ لے گئے، رات وہاں رُکنا پڑا، تو طالبِ علم کو چارپائی پر لٹادیا اور خود نیچے اپنے ہاتھ میں ایک رَسی باندھ کر اس کو اپنے پاس رکھ کر فرمایا: ''خدمت کی ضرورت ہوتو رَسّی کھینچ دینا''۔

تنبیہ میں تدریج اور اُصول کی رعایت رکھیں:

☆اگر طالبِ علم کوتاہی کرتا ہے تو پہلے اُس کو شفقت اور نرمی سے سمجھائیں، اِس کا اثر نہ ہوتو تنبیہ کریں، اس کا بھی اثر نہ لے تو مدرسہ کے ذمہ دار کو اس کے حالات سے مطلع کردیں، اگر بار بار سمجھانے اور تنبیہ کے بعد بھی اس کی حالت درست نہ ہوتو اس کے سرپرست کو مطلع کردیا جائے کہ یہاں اس کا رہنا مفید نہیں، دوسری جگہ بھیج دیا جائے، ممکن ہے وہاں کچھ حاصل کرلے؛ مگر یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے کہ دوسرے کی اصلاح میں اپنے کو فاسد کردے۔

اگر یہ طلبہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جاتے تو.....؟

☆حضرت مولانا اعزاز اُص صاحب اعظمیؒ فرماتے ہیں: بگڑے ہوئے طلبہ پر سختی کرنے میں اگر حدودِ شریعت کا لحاظ نہ رکھا جائے تو خواہ اُن کی اصلاح ہو یا نہ ہو؛ مگر تم بھی تو بگڑ گئے، اب تمہاری اصلاح کون کرے گا؟ طالبِ علم کی اصلاح مقدم ہے یا استاذ کی اصلاح مقدم ہے؟ بعض اساتذہ طلبہ کی اصلاح کرنے کی فکر میں خود ہی بگڑ جاتے ہیں، جب کہ معلم ومربی پر اپنی اصلاح اور اپنی دینی درستگی مقدم ہے، ہم یہ صورذہن سے نکال دیں کہ ہماری اصلاح ہوچکی ہے، علم میں ترقی کے ساتھ تربیت میں اضافہ کے بھی ہم ہروقت محتاج ہیں، غالب امید ہے کہ استاذ کی اصلاح پر طلبہ کی بھی اصلاح ہوجائے گی؛ نیز یہ تصور بھی نکال دیں کہ سختی سے اصلاح ہوتی ہے، سختی کا محل مہمانِ رسول نہیں؛ بلکہ کفار ومنافقین ہیں ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ﴾۔

علمِ نبوی تدریس نہجِ نبوی کے مطابق ہو:

☆علمِ نبوی نبوی نہج کے بغیر بافیض نہیں ہوسکتا؛ بلکہ نائب اگر منیب کا کام منیب کے طریقے پر نہ کرے تو نیابت بھی چھن جاتی ہے، استاذ سے اگر طالبِ علم کی تحقیق ہوتو یہ بدترین جرم وگناہِ کبیرہ ہے، یہ نادان وناواقف ہے؛ مگر جس کی طلب میں آئے ہیں اُس نے ان کا درجہ بڑھادیا ہے۔

☆مسلمان کی یہ شان نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو رُسوا کرے جبکہ وہ مہمانِ رسول بھی ہو ''اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَایَظْلِمُهُ وَلَایَخْذُلُهُ وَلَایَحْقِرُهُ''۔

طلبہ کو ذلیل کرنے کا گناہ معاف ہونا مشکل ہے:

☆ سفیان بن عُیَیْنَہؒ نے فرمایا: ''کسی شخص کا مال ناحق لے کر اُس کی موت کے بعد اُس سے دامن چھڑانے کے لیے اس کے واروں کو مال دیدینا کافی ہے؛ مگر کسی کو بے عزت کر کے اُس کی موت کے بعد اُس کا بدلہ دینا چاہو تو اس کے وارثین؛ بلکہ تمام زمین والے معاف کر دیں تو بھی معاف نہیں ہوگا، پس مؤمن کی عزت اس کے مال سے بڑھ کر ہے، جو تم سے کہا جاتا ہے اُسے سمجھو''۔ (حلیۃ الاولیاء: ۳۲۸/۷)

غبارِ دل دُور کرنے کی بہ نسبت غبارِ کاغذ دُور کرنا آسان ہے:

☆ ہندوستان کے مشہور رحم دل حکمران ناصر الدین محمود حکمرانی کے ساتھ سال میں دو قرآنِ مجید لکھ کر فروخت کر کے گزارا کرتے، ایک موقع سے قرآنِ مجید لکھ رہے تھے، درباری وزیر ملاقات کے لیے آیا تو لکھنا موقوف کر کے متوجہ ہوئے، وزیر کی نظر مخطوطہ پر پڑی، جہاں دو جگہ ''فیہ'' یکے بعد دیگر لکھا دیکھا، تو کہنے لگا کہ: ''یہ دو مرتبہ ''فیہ'' غلط ہو گیا ہے، ایک مٹا دیں''، ناصر الدینؒ نے گول دائرہ بنا لیا کہ مٹا دیتا ہوں، وزیر کے جانے کے بعد دائرہ مٹا دیا؛ چوں کہ وہ تکرار درست تھا، خادم نے یہ منظر دیکھ کر کہا: جب درست تھا تو دائرہ بنایا کیوں؟ فرمایا: اگر دائرہ نہ بناتا اور وزیر کی غلطی ظاہر کرتا، تو شرمندگی میں اپنی بات مکمل کہے بغیر چل دیتا، درباری کی دل شکنی کرنا نہیں چاہ رہا تھا، اور سنو! غبارِ دل دُور کرنے کی بہ نسبت غبارِ کاغذ دُور کرنا آسان ہے۔ (تذکرۂ قاریانِ ہند: ۱۲۶/۱)

تحقیق ومسائل

قواعد فقہ کے؛ مسائل تصوف کے

ازقلم: مولانا محمد یاسین خان صاحب رشادی، استاذ دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور

''فقہ'' لغتِ عرب میں اعلیٰ درجے کی ذہانت اور نہایت گہری بصیرت کو کہتے ہیں۔ اسلام کے قرونِ اُولیٰ اور متقدمین کی اصطلاح میں دین کی تمام تعلیمات یعنی ''عقائد واحکام واخلاق'' کی گہری بصیرت وکامل مہارت کو ''فقہ'' کہا جاتا تھا۔ جس کو اِن تینوں تعلیمات کی گہری بصیرت ومعرفت نصیب ہواور وہ پوری زندگی اِن کے سانچے میں ڈھال چکا ہو، اُس کو ''فقیہ'' کہا جاتا تھا۔ یہی قدیم اصطلاحی معنیٰ والا فقہ، جامع وکامل اور قرآن وسنت کا اصلی مطلوب اور مامور بہ ہے۔ نصوص وآثار میں فقہ وفقیہ کے جو فضائل ومناقب منقول ہیں، اُن کا حقیقی واوّلین اور کامل ومکمل مصداق یہی ''قدیم فقہ'' ہے۔

رہا جدید اصطلاحی معنیٰ والا فقہ، جو صرف اعمالِ ظاہرہ کے احکام کا علم کہلاتا ہے، اور جو ظاہری احکام ہی تک محدود کردیا گیا ہے؛ وہ ''قدیم فقہ'' کا محض تہائی حصہ ہے، جسے متاخرین کے زمانے میں شدید تقاضوں وضرورتوں کے باعث مستقل وعلاحدہ مرتّب کیا گیا؛ لہٰذا صرف اِس جدید اصطلاحی فقہ کو جامع وکامل فقہ سمجھنا، آثار میں مروی فضائل کو اِسی کے ساتھ خاص کرنا اور جامع وقدیم فقہ کی بقیہ دو قسمیں: علمِ عقائد وعلمِ احسان کو فقہ کی تعریف وفضیلت سے خارج خیال کرنا، یقیناً صحیح نہیں ہے؛ اِسی لیے اِس خیالِ فاسد سے بچانے کے لیے اصحابِ بصیرت نے علمِ عقائد کو ''اَلْفِقْهُ الْأَكْبَرُ'' سے، علمِ مسائل کو ''فِقْهُ الظَّاهِرُ'' سے اور علمِ تصوف کو ''فِقْهُ الْبَاطِنُ'' سے موسوم اور ''فِقْه'' کے ساتھ مربوط کیا ہے۔ (مفصل معلومات کے لیے تاریخِ فقہ وتصوف کی معتبر کتابوں کا مطالعہ کیا جائے)۔

فقہ بھی تصوف ہے اور تصوف بھی فقہ ہے:

''الفقه الأكبر'' اپنے موضوع کی عظمت ورفعت، قوت وشوکت اور نزاکت واہمیت کی بنا پر بعض اعبارات سے نسبتاً قوی وبلند تر ہے؛ لیکن ''فِقْهُ الظَّاهِر'' اور ''فِقْهُ الْبَاطِنُ'' دونوں کا رشتہ اِس قدر مربوط ومضبوط ہے کہ دونوں کی بے شمار جزئیات کے مرکزی اُصول اور ضمنی قواعد وضوابط، ایک ہی ہیں، جیسے: ''اَلْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ، إِذَااجْتَمَعَ الْحَلَالُ وَالْحَرَامُ غُلِّبَ الْحَرَامُ.....'' اِن کے اِس قدر گہرے رب وتعلق کی بات ہے کہ محققین نے دونوں کو الگ وجدا نہیں سمجھا؛ بلکہ دونوں کی صحیح معرفت اور گہری

بصیرت کے لیے باہم لازم وملزوم قرار دیا ہے۔ مثلاً:

☆ حکیم الامت حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں:

''تصوف اور فقہ جدا جدا شئی نہیں ہیں، ہاں رنگ مختلف ہیں''۔ (خطبات حکیم الامت: ۱۴۱/۱۰)

☆ ایک دوسرے بیان میں ارشاد فرمایا:

''لوگوں نے آج کل فقہ اور تصوف کو الگ کر دیا ہے؛ ورنہ حقیقت میں فقہ سے مسائل سلوک میں بہت مدد ملتی ہے، یہ دونوں فن بہت ہی قریب ہیں؛ اِس لیے تصوف کو فقہ سے الگ سمجھنا ٹھیک نہیں۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی حقیقت خوب سمجھی ہے، فرماتے ہیں: ''اَلْفِقْهُ مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَالَهَا، وَمَاعَلَيْهَا'' (فقہ، اپنے نفس اور اُس کے متعلق کی معرفت کا نام ہے)، اِس تعریف میں تصوف بھی داخل ہے''۔

نوٹ: حضرت تھانوی کے اِسی بیان پر حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ حاشیہ میں رقم فرماتے ہیں: ''بلکہ وہی اوّل مصداق ہے؛ کیوں کہ پورے طور پر معرفتِ نفس اِسی سے حاصل ہوتی ہے''۔

(خطبات حکیم الامت: ۳۸۰/۱۴)

☆ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

''فقہ کی امام صاحب نے تعریف کی ہے: ''اَلْفِقْهُ: مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَالَهَا، وَمَاعَلَيْهَا'' یہ عام ہے اعمالِ ظاہری و باطنی سب کو، تو تصوف اور فقہ میں منافات کہاں ہے۔ پہلے فقہ اور تصوف کے جامع ہوتے تھے، یہ بلا آج کل ہی پھیلی ہے کہ دونوں کو علاحدہ سمجھ کر دونوں کو خراب کیا؛ حالاں کہ ان دونوں کا ساتھ ہے''۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۲۸۶/۲۰)

☆ ایک جگہ ''فِقْهُ الْبَاطِنْ'' کو ''فِقْهُ الظَّاهِرْ'' سے ماخوذ، اِس کے لیے مطلوب اور ایک لحاظ سے اُس کے افضل واہم ہونے کو بتانے کے لیے حضرت حکیم الامت بیان فرماتے ہیں:

''لوگ یہاں آ کر مجھ سے فقہ کے مسائل دریافت کرتے ہیں۔ میں اُن سے کہتا ہوں کہ: بھائی! فقہ تو دوسری جگہ بھی پوچھ لوگے، یہاں مجھ سے ''فِقْهُ الْفِقْهُ'' پوچھو، جس کا دوسری جگہ اہتمام نہیں''۔

(ملفوظات حکیم الامت: ۱۹۲/۱۱، مطبوع زمزم بک ڈپو دیوبند)

☆ جلیل القدر عالم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (فقہ اور تصوف، ایک تعارف: ۲۳) میں فرماتے ہیں:

''تصوف بھی چوں کہ دین کا ایسا ہی شعبہ ہے جیسا ''فقہ'' اور دونوں میں ربط اِتنا گہرا ہے کہ فقہ پر عمل تصوف کے بغیر، اور تصوف پر عمل فقہ کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا؛ بلکہ ''جو فقہ، قرآن وسنت کا مطلوب ہے''، وہ تو تصوف کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا''۔

فقہی کتاب، تصوف کی بھی کتاب ہے:

اِس کے بعد یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ: وہ کتابیں جو فقہی احکام ومسائل کے موضوع پر لکھی گئی ہیں اور جفقہ کے مآخذ ومراجع کی حیثیت رکھتی ہیں، وہ صرف ''فِقْهُ الظَّاهِرْ'' کی نہیں؛ بلکہ ''فِقْهُ الْبَاطِنْ'' کی بھی کتابیں ہیں اور یہ بات، خود ''تبع تابعین، متقدمین، محققین'' سے صراحتاً منقول ہے، جیسے:

☆ حضرت امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''قِيلَ لِمُحَمَّدٍ: أَلَاتُصَنِّفُ فِي الزُّهْدِ شَيْئًا؟ قَالَ: قَدْصَنَّفْتُ كِتَابَ الْبُيُوْعِ''. کسی نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: حضرت! علمِ زہد وتصوف کے سلسلے میں کیا آپ کی کوئی تصنیف نہیں ہے؟ حضرت امام نے جواب دیا: بھائی! (اس سلسلے میں تو) میری تصنیف ''کتاب البیوع'' پہلے ہی سے موجود ہے......امام محمد کا مطلب یہ ہے کہ میں نے کتاب البیوع میں حلال وحرام بیان کردیا ہے اور زہد وتصوف یہی ہے کہ جو حرام معلوم ہو، اُس سے اجتناب کیا جائے۔ اور جو حلال معلوم ہو، اُس پر عمل کیا جائے''۔

(المبسوط للسرخسي كتاب البيوع، باب الربا: ۱۱۰/۱۲، مطبوع دارالمعرفۃ، بیروت، لبنان)

☆ حضرت امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں:

''امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں ''**كتاب الاستحسان**'' کا نام ''**كتاب الحظر والإباحة**'' رکھا ہے۔ اِس نام کی جگہ اگر ''**كتاب الزهد والورع**'' رکھتے تو زیادہ موزوں رہتا؛ کیوں کہ ''**كتاب الاستحسان**'' میں زہد وورع کے مسائل ہی تو بیان کیے جاتے ہیں، جیسے: کس چیز کو دیکھنا و چھونا جائز ہے؟ اور کس چیز کو دیکھنا و چھونا جائز نہیں وغیرہ''۔

(المبسوط للسرخسي، كتاب الاستحسان: ۱۴۵/۱۰)

☆ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''فقہی کتاب میں تصوف ہی ہے؛ کیوں کہ اس کے ذریعے حلال وحرام کی تمیز ہوگی، حرام سے بچیں گے تو اس سے نور پیدا ہوگا، علم وعمل کی توفیق ہوگی اور اس سے بھی قربِ الٰہی نصیب ہوگا، یہی تصوف ہے''۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۳۶۸/۲۳)

فقہی آیات واحادیث میں تصوف کی فروعات:

فقہ وتصوف دونوں کا یہ رشتہ اِس قدر گہرا ومضبوط ہے کہ وہ نصوص جن کے بارے میں عموماً یہ سمجھا اور سمجھا دیا گیا ہے کہ وہ صرف فقہی مسائل سے متعلق ہیں- اگر چہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے؛ مگر یہ حقیقت ہے کہ- اُن میں جس طرح ''فِقْهُ الظَّاهِرُ'' ہے؛ اِسی طرح ''فِقْهُ الْبَاطِنْ'' بھی ظاہر وباہر ہے۔ وہ آیات ومرویات فقہ اور تصوف، دونوں کے احکامات وہدایات پر مشتمل ہیں۔ اِس بابت چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

☆ سورۂ بقرہ (آیت:۲۳۱) میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا﴾ اِس جملے میں مطلقہ عورتوں سے متعلق اُن کے ذمہ داروں کے نام ایک فقہی حکم کا بیان ہے۔ اِس فقہی آیت وجملے سے فقہی حکم کی طرح احسان وتصوف کا ایک زبردست اُصول ظاہر ہوتا ہے؛ چناں چہ حضرت امام تھانوی رحمۃ اللہ علیہ رقم فرماتے ہیں:

''اِس میں اِس پر دلالت ہے کہ جو امر مُفضِی الی المذموم ہو، وہ مذموم ہے؛ چناں چہ اِمساک بغرض اِعتداء سے نہی فرمائی اور یہ تصوف کی فروعِ کثیرہ کی اصل ہے''۔ (بیان القرآن:۱۴۳/۱)

☆ سورۂ نور (آیت:۲) میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿لَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ﴾ اِس میں زنا کار مرد وعورت پر حد لگانے سے متعلق فقہی حکم مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ اِسے بابِ احسان وتصوف میں مشائخ تصوف کے ایک معمول پر استدلال کرتے ہوئے حضرت امام تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''﴿لَا تَأْخُذْكُمْ الخ﴾ اِس سے ماخوذ ہوتا ہے کہ بعض خطاؤں میں رعایت مضر ہے اور یہ اصل ہے مشائخ کے اُس معمول کی کہ مرید کی بعض غلطیوں میں تسامح نہیں فرماتے''۔ (بیان القرآن:۱۱۱/۲)

☆ سورۂ نساء (آیت:۵۸) میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰى اَهْلِهَا﴾ ہے، اِس قانونی حکم والی آیت سے مشائخِ تصوف کے نام ایک حکم کا استنباط کرتے ہوئے حضرت امام تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اگر امانت کو عام لے لیا جائے تو آیت میں مشائخ کو بھی امر ہوگا کہ برکات کو اُن کے اہل تک پہنچا دیں اور جو شخص خلافتِ ارشاد یہ کا اہل ہو، اُس کو اجازت دیں''۔ (بیان القرآن:۵۳۶/۱)

نوٹ: مزید استنباطات وافادات کے لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی تالیف ''**مَسائل السلوک من کلام ملک الملوک**'' کا مطالعہ فرمائیں۔

☆ **السنن لأبي داؤد (باب رفع الصوت بالقراءة في صلاة الليل)** میں مروی ہے کہ: حضرت

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آہستہ تلاوت فرمارہے تھے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بلند آواز سے، دونوں حضرات سے اُن کے طرزِ عمل کی غرض معلوم کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اِرْفَعْ قَلِیْلًا'' (آپ آواز کو تھوڑا سا بلند کریں) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اِخْفِضْ قَلِیْلًا'' (آپ اپنی آواز کو تھوڑا سا کم کرلیں)۔

عموماً محدثین وفقہاء فرماتے ہیں کہ: اِس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فقہی مسئلہ بیان کیا ہے کہ تلاوت میں اعتدال مطلوب ومستحسن ہے؛ لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اِس حدیث کی شرح میں ایک بیش قیمت بات نقل فرمائی ہے، جو یقیناً ''فقہ الفقہ'' کی عمدہ مثال ہے؛ چناں چہ آپ فرماتے ہیں:

''اِس کی توجیہ میں اختلاف ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن حضرات کو یہ حکم کیوں فرمایا۔ علمائے ظاہر نے تو مختلف توجیہات پیش کی ہیں؛ لیکن ابنِ عطا اسکندری فرماتے ہیں کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو اپنی رائے اور تجویز سے ہٹانا چاہا اور دونوں کے ارادوں کو فنا کردیا، مقصود تھا کہ تم اپنی رائے سے کوئی کام نہ کرو؛ بلکہ ہر کام میں ہمارے اتباع کا قصد کرو، یہی تفویض ہے اور اِسی کا نام فنا ہے''۔ (خطبات حکیم الامت: ۲۲/۲۳)

نوٹ: شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی زید مجدہٗ نے یہی بات حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحئی قدس اللہ سرہٗ سے نقل فرمائی ہے کہ:

''فرمایا کہ: حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب میں جو بات ارشاد فرمائی تھی کہ: ''میں جس کو سنا رہا ہوں، اُس نے سن لیا، زیادہ سزور سے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے''؛ تو یہ بات غلط نہیں تھی اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ طبعی طور پر چوں کہ تیز آواز والے تھے؛ اِس لیے نماز میں اگر اُن کی آواز بلند ہوگئی، تو کوئی ناجائز بات نہیں تھی؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اب تک تم دونوں اپنی مرضی اور اپنی رائے سے پڑھ رہے تھے، اور اب ہمارے کہنے کے مطابق پڑھو اور اب ہماری تجویز کے مطابق پڑھو۔ تو پہلے جس طریقے سے پڑھ رہے تھے، وہ چوں کہ اپنی تجویز اور اپنی مرضی کے مطابق تھا، اُس میں اِتنی نورانیت اور اتنی برکت نہیں تھی، اب ہماری تجویز کے مطابق پڑھو گے، تو اس میں نورانیت اور برکت ہوگی''۔

حضرت شیخ الاسلام زید مجدہٗ فرماتے ہیں:

''یہ ہے سارے دین کا خلاصہ کہ اپنی تجویز کو دخل نہ دو، جو کوئی عمل ہو، وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو''۔ (اصلاحی خطبات: ۱۴۱/۲، مطبوع میمن اسلامک پبلشرز کراچی)

☆ محدث عظیم، فقیہ النفس حضرت امام رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی تدریس حدیث کا کمال و امتیاز بیان کرتے ہوئے، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''علومِ شرعیہ کے ضمن میں معرفت وحقیقت بتلاتے اور سلوک وطریقت کی تحصیل کا شوق دلاتے جاتے تھے، کسی کسی طالبِ علم کو اِس درس میں وجد آجاتا، چٹک پائے ہوئے قلب کو حال پیدا ہو جاتا تھا؛ چناں چہ مولانا روشن خان صاحب مرادآبادی جس زمانے میں حضرت سے حدیث پڑھتے تھے؛ چوں کہ مولانا قاسم العلوم سے بیعت تھے اور تحصیل کے لیے گنگوہ بھیجے گئے تھے؛ اِس لیے ساتھ ہی ساتھ باطنی علوم بھی سیکھتے اور ذکر وشغل کیا کرتے تھے۔ طبیعت تھی مغلوب الحال اور پیدا ہونے والی تھی نسبتِ وجدی؛ اِس لیے بسا اوقات اُچھل اُچھل پڑتے اور رورو دیا کرتے تھے......ایک حدیث آئی، جس کا یہ مضمون کہ'' آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ممبر پر چڑھ کر خطبہ شروع کیا، آپ کیفیت میں اِدھر اُدھر جھومتے تھے، جس سے اندیشہ ہوتا تھا کہ خدانخواستہ ممبر سے گر نہ جائیں''، اِس پر مولوی محمد روشن خان صاحب بولے کہ حضرت یہاں سے تو حال ثابت ہو گیا اور وجد کا پتہ چل گیا، امام ربانی مسکرائے اور جی ہاں کہہ کر دوسری تقریر شروع کردی''۔ (تذکرۃ الرشید: ۱/۱۳۷، دارالکتاب دیوبند)

فقہی احکام میں تصوف کی بنیادیں وعلتیں:

مذکورہ مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ فقہی آیات اور روایات میں ''فِـقْـهُ الـظَّاهِر'' کے مانند ''فِقْهُ الْبَاطِنْ'' بھی موجود وماخوذ ہے، فقہی نصوص کی طرح فقہاء کی کتب وتحریرات میں اور فقہی مسائل وجزئیات میں بھی تصوف وتزکیہ کے بیانات، صراحتاً وجود ہیں، حتیٰ کہ بعض فقہی احکام ومسائل تو وہ جن میں اُن کی ''علت ومدارِ حکم'' کے حوالے سے وہ اُمور، مذکور ہیں جو ''فِـقْـهُ الظَّاهِرْ'' سے زیادہ ''فِقْهُ الْبَاطِنْ'' یعنی تصوف وسلوک کے خاص موضوعات میں سے ہیں۔ مثلاً:

☆ نماز باجماعت میں امام کا اُونچی جگہ پر تنہا کھڑا ہونا (جب کہ مقتدی نیچے کھڑے ہوں) مکروہ ہے۔ اِس پر امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وفي قيامه على الدكان تشبه باليهود، واظهار التكبر على القوم، وذٰلك مكروه''
امام کے دکان (اُونچی جگہ) پر کھڑے ہونے میں کراہت کی دو علتیں ہیں: ایک علت، یہود سے مشابہت ہے، دوسری علت لوگوں پر بڑائی وتکبر کا اظہار ہے؛ بایں وجہ ایسا کھڑا ہونا مکروہ ہے''۔

(المبسوط للسرخسي باب افتتاح الصلاة: ۱/۴۰ مطبوع دارالمعرفه، بيروت)

اِس عبارت میں صاف تصریح ہے کہ: مکروہ ہونے کی ایک علت ''اظہارِ تکبر'' ہے۔ اور یہ بات تو سبھی اہلِ فہم کو معلوم ہے کہ تکبر و اظہارِ تکبر کا بیان، تزکیہ و تصوف کے خصوصی موضوعات میں سے ہے۔

☆ نماز میں جمائی آجائے تو نمازی کو چاہیے کہ وہ منھ ڈھانکے، اِس حکم کی دو علتیں ہیں: ایک نقلی اور ایک عقلی۔ عقلی علت بیان کرتے ہوئے حضرت امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ رقم فرماتے ہیں:

''لِأَنَّ تَرْکَ تَغْطِیَةِ الْفَمِ عِنْدَ التَّثَاؤُبِ فِي الْمُحَادَثَةِ مَعَ النَّاسِ تُعَدُّ مِنْ سُوْءِ الْأَدَبِ، فَفِيْ مُنَاجَاةِ الرَّبِّ أَوْلٰی'' لوگوں سے بات چیت کے دوران جمائی آجانے کے وقت منہ نہ ڈھانکنا، بداخلاقی میں شمار کیا جاتا ہے۔ رب تعالیٰ سے مناجات کے وقت - جمائی آنے پر منہ نہ ڈھانکنا - تو بہ درجۂ اولیٰ بداخلاقی ہے۔

(المبسوط للسرخسي باب افتتاح الصلاة: ۲۹/۱، مطبوع دار المعرفه، بیروت)

اِس عبارت میں جو بیان ہے، وہ خاص علمِ اخلاق یعنی احسانِ تصوف سے متعلق ہے۔

☆ دِیت کے باب میں ایک لفظ ''عَاقِلَة'' آتا ہے، ''عاقلہ'' اُن لوگوں کو کہا جاتا ہے، جن کے درمیان مصیبت و تکلیف کے وقت ایک دوسرے کی اعانت و حفاظت اور باہمی نصرت و حمایت کا رشتہ قائم و مضبوط ہو۔ جب ایک محلے کے لوگوں میں اور ایک صنعت و حرفت سے متعلق افراد میں، آپسی امداد و تعاون کا رشتہ مضبوط تھا، تب فقہاء نے اہلِ محلّہ کو اور ہم پیشہ افراد کو ''عاقلہ'' قرار دیا تھا؛ مگر جب اور جہاں آپسی تعاون و خیر خواہی کی جگہ حسد و جلن، بغض و کینہ غالب ہو گیا اور ایک دوسرے کے لیے بدخواہی و اذیت رسانی کا مرض حاکم بن گیا، تب وہاں فقہاء نے یہ مسئلہ بیان کیا کہ اب ایک ہی محلے و پیشے والوں کو ''عاقلہ'' قرار دینا محلِ تامل اور قابلِ غور ہے۔ مشہور حنفی فقیہ محمد بن علی دمشقی، صاحبِ درمختار، علامہ حصکفی (وفات: ۱۰۸۸ھ) کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

''والحاصل أن التناصُر أصل في هٰذا الباب، ومعنى التناصر أنه إذا حزبه أمر قاموا معه في كفايته..... وفي تنوير الأبصار معزيا للحافظية: والحق أن التناصر فيهم بالحرف فهم عاقلته. فليحفظ. وأقره القهستاني؛ لكن حرّر شيخ مشايخنا الحانوتي: أنّ التناصر مُنتف؛ لأن لغلبة الحسد والبغض، وتمنّي كلّ واحد المكروه لصاحبه. فتنبّه''.

(الدر المختار مع رد المحتار: ۳۳۴/۱۰، ۳۳۵۵، مطبوع دار عالم الكتب، رياض)

غور فرمائیں: اِس صریح و واضح عبارت میں ''عاقلہ'' کی تعریف و تحدید اور اُس کے مصداق و محل کے حوالے سے

''باہمی نصرت واعانت'' کا ''جذبہ وعمل'' اور ''آپسی حسد وبغض اور کینہ ونفرت'' کا بیان ''علتِ مؤثرہ'' کے طور پر مذکور ہے۔ اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ: مذکورہ دونوں باتیں علمِ تصوف وتزکیہ کے خاص مسائل وموضوعات میں سے ہیں۔

''ہدایہ'' کی عبارات میں تصوف کے بیانات:

☆ صاحبِ ہدایہ حضرت امام مرغینانی رحمۃ اللہ علیہ تکبیرِ تحریمہ کے وقت رفع یدین کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''**یرفع یدیه أولا ثم یکبر؛ لأن فعله نفي الکبریاء عن غیر اللّٰه تعالیٰ؛ والنفي مقدم علی الإثبات**'' نمازی سب سے پہلے ہاتھوں کو اُٹھائے، پھر تکبیر کہے؛ کیوں کہ اِس طرح ہاتھ اُٹھانے کا مطلب اللہ تعالیٰ کے سوا باقی ہر چیز سے بڑائی کی نفی کرنا ہے۔ اور نفی، اثبات سے مقدم ہے''۔ (الهداية، باب صفة الصلاة: ۱/۱۸٤)

اِس کلام کی شرح میں صاحبِ جوہرہ امام ابوبکر بن علی الحدادرحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''**کأنّه نبذ ماسوی اللّٰه تعالیٰ وراء ظهره، فالید الیمنیٰ کالآخرة، والیسریٰ کالدنیا**'' اِس وقت رفعِ یدین کے ذریعے نمازی گویا اِس راز کا اظہار کرتا ہے کہ اُس نے اللہ تعالیٰ کے سوا دَارین کی ہر چیز کو اپنے پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ داہنے ہاتھ سے گویا آخرت مراد لی ہے اور بائیں ہاتھ سے دنیا''۔ (الجوهرة النيرة: ۱/۳۲۸)

دیکھ لیجیے: صاحبِ ہدایہ کی عبارت میں اور صاحبِ جوہرہ کی معنیٰ خیز تشریح میں جو کچھ بیان ہے، وہ ''**أن تعبد اللّٰه کأنک تراه، فإن لم تکن تراه فإنه یراک**'' سے ماخوذ وحاصل ہے۔ یہی تزکیہ، تصوف اور سلوک ہے۔

☆ اگر نمازی جنت کے شوق میں یا جہنم کے خوف سے تڑپ اُٹھتا ہے، بلند آواز سے رو پڑتا اور آہ کر جاتا ہے، تو اِس سے نماز فاسد نہیں ہوتی، جس کی وجہ امام مرغینانی بیان کرتے ہیں کہ:

''**لأنّه یدلّ علیٰ زیادةِ الخشوعِ**'' اِس لیے کہ نمازی کا یہ عمل خشوع کی زیادتی پر دلالت کرتا ہے''۔ (الهداية، باب صفة الصلاة: ۱/۲٦۳، مطبوع مكتبة البشریٰ)

''خشوع'' کی جو بات اِس عبارت میں ہے، اُس کی بابت جملہ تفصیلات تو صرف علمِ تصوف واحسان ہی میں ملتی ہیں۔ اِس فقہی عبارت ومسئلے کا فہم، علمِ تصوف کے بغیر یقیناً ناقص ہے؛ اِسی لیے تو کہا گیا ہے کہ: فقہ کے لیے تصوف اور تصوف کے لیے فقہ لازم وملزوم ہیں۔

☆ حج یا عمرہ کے موقع پر بیت اللہ کی زیارت کے وقت صحابہؓ وتابعینؒ سے بعض دعائیں منقول ہیں؛ لیکن حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس خصوصی وعظیم موقع پر کوئی مخصوص دعا اپنی کتاب ''الاصل'' میں کسی خاص دعا کا ذکر نہیں کیا، صاحبِ ہدایہ اِس کی وجہ بیان کرتے ہیں:

''**لأن التوقيت يذهب بالرقة؛ وإن تبرک بالمنقول فحسن**'' اِس لیے کہ اِس سے (دلی) رقت ونرمی دُور ہوجاتی ہے؛ ہرچند منقول دعائیں تبرکاً پڑھنا بہتر ہے۔

(الهداية، باب صفة الصلاة: ۱۷۷/۲، مطبوع مكتبة البشرىٰ)

غورفرمائیں: فقہی مسائل سے تصوف کا ربط کس قدر گہرا، کس قدر اثر پذیر ہے؟ اِن حضرات فقہاء کی نظر صرف ''**فِقْهُ الظَّاهِرُ**'' پر ہے، یا ''**فِقْهُ الظَّاهِرُ**'' اور ''**فِقْهُ الْبَاطِنُ**'' دونوں پر ہے۔ اور کیا اِس سے صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ حضراتِ ائمہ صرف فقہاء نہیں تھے؛ بلکہ ''فقہاء میں صوفیاء'' اور ''صوفیاء میں فقہاء'' تھے؟۔ اور کیا احسان تصوف کی صحیح معرفت کے بغیر، مذکورہ احکامِ فقہیہ اور عباراتِ فقہیہ کا صحیح علم وفہم ہوسکتا ہے؟۔

اِس تمام تفصیلی کلام کا حاصل وخلاصہ یہ ہے کہ: فقہ وتصوف دونوں علوم آپس میں بہت زیادہ قریب ومربوط ہیں۔ ہردو میں بصیرت ومہارت کے لیے باہم لازم وملزوم ہیں۔ اِن دو میں بھی علمِ ''فقہ'' ایسا عظیم فن ہے کہ تصوف کے بے شمار مسائل میں نہایت مفید ومعین اور کافی حد تک شافی وافی ہے۔ حضرت شیخ احمد زروق فاسی رحمۃ اللہ علیہ فقہ کی عظمتِ جامعیت وافادیت بیان کرتے ہیں کہ:

''**كفىٰ الفقهُ عنِ التصوّفِ**''، علمِ فقہ، علمِ تصوف کی جانب سے کافی ہے''۔

(قواعد التصوف للفاسي: ۲۸۱)

حرفِ اختتام:

جب یہ بات ثابت وظاہر اور مفہوم ہوگئی کہ: ''**كَفىٰ الْفِقْهُ عَنِ التَّصَوّفِ**''، یعنی فقہ سے مسائلِ سلوک میں بہت مدد ملتی ہے؛ کیوں کہ یہ دونوں فن بہت ہی قریب ہیں، تو اب صرف دو باتیں سمجھنی باقی ہیں کہ علمِ فقہ، تصوف کے حوالے سے معاون وکافی ہے؛ تو کس حد تک ہے؟ اور کس طور سے ہے؟ عرض ہے کہ:

کس حد تک کافی ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ: علمِ فقہ کی یہ کفایت وافادیت اکثری ہے، کلی نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ سلوک کے اکثر مراحل اور بیشتر مسائل میں مدد ملتی ہے؛ کیوں کہ تزکیہ واحسان کے بعض مسائل اِس قدر دقیق ہوتے ہیں کہ اُن کا صحیح حال دیکھنے کے لیے نگاہِ ظاہری ناکافی ثابت ہوتی ہے۔ اُن کا صحیح حال ومقام، باطنی نگاہِ بصیرت کے بغیر نظر ہی نہیں آتا۔

کس طور سے کافی ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ: ''فِقْهُ الْبَاطِنْ'' کے مراحل ومسائل میں ''فِقْهُ الظَّاهِرْ'' کی کفایت وعانت؛ بعض اوقات عبارۃ النص سے ہی صاف صاف نظر آجاتی ہیں۔ بعض اوقات اشارۃ النص سے صاف وصریح اشارہ، بلاتکلف نمایاں ہوجاتا ہے۔ بعض مرتبہ دلالۃ النص سے علت اور وجہ کے ساتھ قوی دلالت قائم ہوتی ہے..... بعض مرتبہ ظاہری صورت کا بیان باطنی کیفیت کے مناسب وموافق ہوتا ہے، تو اِس مناسبت وموافقت کے باعث ظاہری جزئیہ کا جو حکم ومقام ہوتا ہے، وہی باطنی مسئلے کا ہوتا ہے، بیشتر ایسا ہوتا ہے۔

الغرض! آپ کے سامنے آئندہ صفحات میں- ان شاءاللہ- چند سطور پیش کرتا ہوں، جن میں اُصول وقواعد تو ہوں گے ''فقہ'' کے؛ لیکن فروع ومسائل ہوں گے ''تصوف'' کے۔ اُمید کرتا ہوں کہ- بہ توفیقِ خداوندی- اِن سے اہلِ فقہ اور اہلِ تصوف دونوں طبقات کو نفع ہوگا۔ اور- دونوں حکمائے امت- کی جانب سے مجھ خاک نشین کو دعاؤں سے نوازا جائے گا۔ **اللّٰهمّ اجعل سريرتي خيراً من علانيتي، واجعل علانيتي صالحةً.**